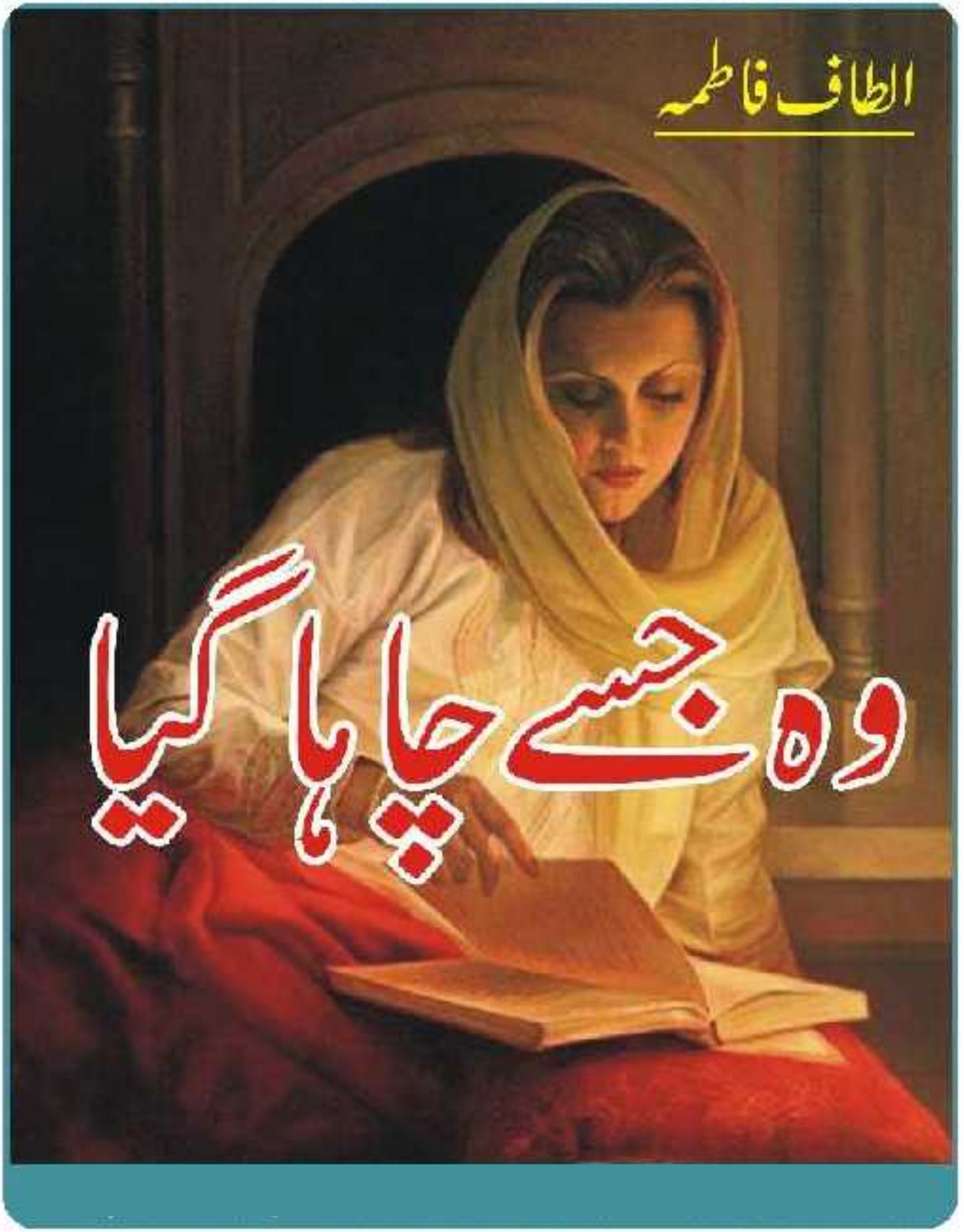
الطاف فاطمہ
وہ جسے چاہا گیا

وہ جسے چاہا گیا

(افسانے)

الطاف فاطمہ

وہ جسے چاہا گیا

''وہ جسے چاہا گیا۔''

''اس نے اپنے نام کے یہی تو معنی بتائے تھے۔''

جم نکولس نے ٹیلیویژن پر تھرکتی ہوئی صورتوں کی طرف سے منہ پھیر کر سوچا۔

''پر وہ نام تھا کیا؟''

یہ اس کے ذہن سے اتر گیا تھا اور ذہن سے تو کیا اترا تھا' دماغ کے کسی گوشے میں ناچتا پھر رہا تھا مگر سامنے نہ آتا تھا یعنی یہ کہ وہ زبان پر نہ آ رہا تھا۔ اب وہ نام دماغ کے کسی کونے میں گھسا بیٹھا تھا۔ یہ بھی پتا نہ چل رہا تھا۔ ممکن ہے کہ لاشعور کے کسی کونے میں جا کر دبک رہا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ تحت الشعور میں جا چھپا ہو۔ غرض کہ جو کچھ بھی ہوا جم نکولس ایک الجھن میں مبتلا تھا۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ دماغ میں تو نام گھوم رہا ہے اور زبان پر اس کا ترجمہ ٹہلتا پھر رہا ہے۔

''وہ جسے چاہا گیا''

وہ جسے چاہا گیا''

وہ جسے چاہا گیا''

''یا خدا' مگر وہ ہے کون کم بخت جسے چاہا گیا یا چاہا گیا تھا یا چاہا جا رہا ہے؟'' وہ کچھ اتنی بوریت کے عالم میں تھا کہ گرامر جیسی خشک اور ہونق چیز بھی اس کو بہت مانوس اور خیال آرائی کے قابل معلوم ہو رہی تھی جبھی تو وہ اپنے دماغ کو گردانوں میں الجھا کر' اصل بات بھولنے کی کوشش کر رہا تھا' مگر خیر یہ بات تو صاف تھی کہ وہ کون تھا ''جس کو چاہا گیا'' وہ سادہ سادہ سا' چپ چپ سا ریشمی آنکھوں والا چہرہ تو صاف صاف پیش نظر تھا جس کے نام کے معنی ذہن میں گھوم گھوم کر خواہ مخواہ اس کو یعنی سینتالیس سالہ کنوارے' شعبہ صحافت کے سینئر پروفیسر' ڈاکٹر جم نکولس کو تنگ کر رہے تھے جو بیروت یونیورسٹی میں اپنی پانچ سالہ خدمات پوری کر کے ایک سال ہوا وطن واپس آیا تھا۔

وہ مستقل ٹیلیویژن کی طرف پیٹھ موڑے بیٹھا دریچے کے شیشوں کو تک رہا تھا۔ اس کے چہرے کا تاثر یوں بھی روٹھا روٹھا سا تھا

اور اب تو واقعی وہ روٹھا بیٹھا تھا۔ کہتے ہیں ہچکیاں نہ رکتی ہوں تو کسی انسان کو الجھن میں ڈال دو فوراً رک جائیں گی' لیکن شاید بعض وقت یوں بھی ہوتا ہے کہ الجھن حد سے بڑھ جائے تو ہچکی آنے لگتی ہے کم سے کم جم نکولس کے ساتھ تو اس وقت یہی ہوا بے وجہ ہی اس کو ہچکیاں آنے لگیں۔ ہیچ ہی ہپ توبہ! مگر حبیبہ تو کہتی تھی کہ ہچکیاں آنے کا مطلب اس کے ہچکیاں آنے کا مطلب اس کے یہاں یہ ہوتا ہے کہ ہمیں کوئی یاد کر رہا ہے۔'' ہیچ ہیچ..... کیا مطلب حبیبہ.....

اوہ! اے! وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ ''بس ہاں حبیبہ ہی تو تھا وہ نام'' وہ با آواز بلند بولا۔ کمرے میں تنہائی تھی۔ البتہ اس کی پشت کی طرف رکھے ہوئے ٹیلیویژن پر پرچھائیاں اور تصویریں اب تک تھرک رہی تھیں اور مستقل بولے چلی جا رہی تھیں۔

شٹ اپ! وہ مڑا اور اس نے ٹیلیویژن بند کر دیا۔

لو بس یہی نام تو تھا اس کا۔۔۔۔۔۔۔ حبیبہ یعنی وہ جس کو چاہا گیا۔ بس فقط اتنا چھوٹا اور مختصر سا تو نام تھا وہ بھی بھول گیا' مگر وہ یاد رکھنے کی کوئی چیز بھی تو ہو۔ اس کے مقابلے میں بیروت یونیورسٹی کی کوئی طالبہ یا پھر کوئی کولیگ ہوتی تو کوئی بات تھی۔ لمبی چوڑی' خوش شکل زیتونی اور شہابی رنگتوں اور آنکھوں والی' اسکرٹوں اور فراکوں میں ملبوس' ایشیائی لڑکیاں یا لڑکی نما عورتیں۔ ان سب کے نام تو یوں فر فر یاد تھے اور کتنیوں کے تو خط بھی آتے رہتے تھے پر یہ حبیبہ کا نام یاد رکھنے کا تک کیا ہو سکتا ہے۔

چھوٹی سی' مختصر سی' سانولی سی' وہ مہمان لڑکی جو مشکل سے اٹھارہ سال کی ہو گی یا پھر بھی وہ ضرورت سے زیادہ چھوٹی نظر آتی تھی۔ بہر حال تھی تو وہ مہمان لڑکی طالب علموں کے بین الاقوامی تبادلے کے سلسلے میں آئی ہوئی لڑکی جو اپنے ایک اور ساتھی کے ساتھ جم نکولس کے بھائی کے گھر ٹھہرائی گئی تھی اور جم نکولس ان دنوں تازہ تازہ بیروت سے واپس آ کر وہاں چھٹیاں گزارنے پہنچا ہوا تھا۔

''ارے یہ بچے بچیوں کے بین الاقوامی تبادلے.....''

جم نکولس دل کھول کر ہنسا تھا۔ ''ایک لطیفہ ہی ہیں۔'' سنا ہے کہ جب امریکی طالب علم بطور مہمان دوسرے ملکوں کو جاتے ہیں تو کچھ اس قسم کی ہدایتیں بھی جاتی ہیں کہ اگر آپ کا مہمان غسل خانے وغیرہ میں زور زور سے الاپنا شروع کر دے' تو آپ کو اعتراض نہ ہونا چاہیے یہ ان کی عادت میں داخل ہے اور اگر وہ بے قاعدگی پھیلائیں تو اس کو ان کے فطری انداز پر محمول کریں۔ مزید یہ کہ چیزوں اور دولت کی بہتات نے ان کو غیر محتاط کر دیا ہے اگر ان کے ہاتھ سے برتن ورتن ٹوٹیں' تو ملال نہ کیجئے گا وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ پاکستانی لڑکیاں۔۔۔۔۔۔ ان کے ساتھ اس قسم کی ہدایتیں آئی ہوں گی۔ مثلاً یہ کہ جدھر جدھر یہ چلا کریں' لوگ پردے تان کے چلا کریں اور یہ کہ اکیلے وکیلے نہ جانے دیا جائے گھر کی کوئی بڑی بوڑھی یا کوئی دوسرا معتبر شخص ساتھ چلا کرے اور نامحرم مرد گھر میں آواز دیئے

بغیر داخل نہ ہو۔ جم ایک بار پھر ہنسی سے بے حال ہو گیا۔

بیروت جیسے مغرب زدہ ایشیائی شہر میں رہنے کے باوجود وہ مشرقی مسلمان گھرانوں کی بعض پابندیوں سے واقف ہو گیا تھا جن کو حد سے زیادہ مبالغے کے ساتھ بیان کرنا زیادہ پسند کرتا تھا۔

مسز نکولس، یعنی اس کی بھاوج قطعی سنجیدگی سے برا مان گئی تھی۔ بالکل غلط، ایسی تو کوئی ہدایت نہیں ملی اور اب اس کا اصرار تھا کہ جم نکولس کو لازم ہے کہ ان کی ہدایات کا بغور مطالعہ کرے۔ ان میں کہیں بھی ایسی کوئی شق موجود نہیں۔ ایسی سنجیدگی مسز نکولس کی عادت میں داخل تھی۔

اور دوسری صبح اس کا تعارف جن دو مہمان لڑکیوں سے کروایا گیا وہ ایک دوسری کی ضد تھیں۔

ایک جتنی مختصر دبلی پتلی، بے حقیقت اور خاموش تھی دوسری اس قدر ہٹی کٹی، گوری چٹی اور خوش باش تھی۔

''کیا سچ مچ یہ دونوں ایک ہی ملک کی رہنے والی ہیں؟'' اس نے بار بار پوچھا تھا اور ہر بار اس کو یہ جواب ملا تھا کہ ایک ہی شہر کی رہنے والی ہیں۔

وہ گوری چٹی اور خوش باش لڑکی عذرا تھی اور اس کے بال فرح دیبا کے انداز میں کٹے ہوئے تھے۔ اس کو دیکھ کر جم نکولس نے دل میں کہا تھا۔ ''عذرا بانو، تم میں ایسی کیا خاص بات تھی جو تم کو یہاں بھیجا گیا۔'' عذرا بانو اپنے ناخنوں کی تراش خراش کے بارے میں بہت ہی محتاط تھی۔ جم نکولس کی بھتیجی ولما نے اس کو سرگوشیوں میں بتایا تھا۔ ''عذرا بانو جس دن سے آئی ہے کم سے کم دس مختلف شیڈز کی نیل پالش لے چکی ہے ہر صبح بڑی احتیاط سے گزشتہ پالش کو اتارتی اور دوسرے میں رنگتی ہے اور۔۔۔۔۔۔ اور یہ کہ اسکول گرل تو کیا ہی لگتی ہے بالکل لیڈی لائیک ہے۔''

''تم بھی تو لیڈی لائیک ہونے کی کوشش میں ہو ولما ڈارلنگ'' اس نے اپنی بھتیجی کے ہلکی سی چپت لگائی۔

مگر ابھی مجھے ممی اجازت کب دیتی ہیں۔ اور یہ عذرا بانو اس قدر پر تکلف اور بھڑکیلے کپڑے پہنتی ہیں اور ایسی آنکھیں بنا کر بیٹھتی ہیں کہ۔۔۔۔''

دراصل ولما کو عذرا بانو کے کتابی چہرے، روشن آنکھوں اور شوخ رنگ کپڑوں پر کچھ رشک بھی آ رہا تھا۔ اس لیے اس کی ممی تو اس کے لیے بھوسلے، فاختئی، سرمئی اور ایسے ہی اسکولی لڑکیوں والے رنگ منتخب کرتی تھی۔ ایک سے ایک قیمتی امریکن کپڑا اور رنگوں کے انتخاب کی وجہ سے سویا سویا ہی رہتا تھا۔ دراصل ممی کی پسند ہی سوتی سوتی سی تھی۔ اوپر سے اس کا چہرہ کچھ ضرورت سے زیادہ لمبا اور

ماتھا ضرورت سے زیادہ سپاٹ تھا۔

خدا جانے یہ ممی مجھے ٹین ایج سے کب نکالیں گی۔ وہ اکثر سوچا کرتی تھی' گویا ٹین ایج سے نکال لینا بھی ممی کے اپنے اختیار کی بات تھی۔

ایک بات یہ ہے کہ عذرا بانو بولتی بھی بہت ہے۔ پتا نہیں نروس ہے یا کیا چپ ہی نہیں رہتی اور اس کی باتوں کا موضوع بھی یہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ بہت زیادہ ایڈوانس اور رئیس ہے۔

''مگر تمہاری دوسری مہمان کس قسم کی ہے اور اس کے متعلق تمہاری رائے کیا رائے ہے؟'' جم نکولس نے اس دوسری خاموش دزدیدہ سی شکل اور ریشمی آنکھوں والی لڑکی کی طرف کنکھیوں سے دیکھا جو اپنی خاموشی کی وجہ سے پراسرار اور ناقابل فہم سی نظر آتی تھی اور ان دونوں سے بہت فاصلے پر گھنے درخت کے سائے میں بیٹھی لان کے سبزے کو تک رہی تھی۔

''یہ! یہ تو! بس عجیب سی ہے بالکل خاموش اور عجیب قسم کی ہے۔'' ولما کی رائے اس کے بارے میں مختصر ضرور تھی' لیکن کچھ اچھی بھی نہ تھی۔

''میں بتاؤں ولما جب لڑکی ٹین ایج سے بس نکلنے ہی والی ہوتی ہے' تو اس کو اپنے سوا ہر کوئی عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔'' وہ ہنس پڑا۔

''اوں انکل!'' ولما اپنی ضرورت سے زیادہ لمبان کے باوجود بچوں کی طرح بکھر گئی۔

وہ دوسری خاموش لڑکی جم نکولس کو حد سے زیادہ محتاط نظر آئی دھیرے سے اٹھنا' دھیرے سے بیٹھنا' چمکدار بالوں کی موٹی سی چوٹی کو اپنے نحیف و نزار کاندھوں کے درمیان یوں اٹھائے جیسے یہ بھی کوئی بھاری بوجھ ہو۔

وہ بولتی تو یوں دھیرے دھیرے سوچ کر جیسے کوئی بیٹھا موتی پرو رہا ہے۔

''اچھا تو اور کیا عادت تھی اس کی۔۔۔۔۔۔۔ اب اس وقت اور اتنے مہینوں بعد اس کی کسی بات کو یاد کرنا ذہن کو مشقت میں مبتلا کرنا تھا اور وہ بلا وجہ ہی اس مشقت میں مبتلا تھا اچھے خاصے خوشگوار موسم کے باوجود اس کو خنکی اور باہر کی ہوا کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی اس نے بڑھ کر دریچہ کھول دیا۔ ہوا کے آزاد اور نکھرے نکھرے جھونکے کی ہمراہی میں ڈوبتے سورج کی چند کرنیں بھی دبی دبی سہمی سہمی اندر چلی آئیں اور اچانک ہی جم نکولس کو محسوس ہوا جیسے وہ لڑکی بھی اپنے مخصوص دبے دبے انداز میں اندر آ گئی ہو جو ولما کے بقول واقعی عجیب سی تھی۔ وہی جو بے تکلفی سے بیٹھی بیٹھی جم نکولس یا اس کے بڑے بھائی کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر

بے اختیار دوپٹے سے سر ڈھانک لیا کرتی تھی اور کسی بات پر قہقہہ لگاتے لگاتے ان کو دیکھ کر رک جاتی تھی۔ اس کی اس حرکت پر ولما کے ساتھ عذرا بھی ہنس دیتی تھی اور اب اس وقت ایک چھوٹی سی بالکل ہی معمولی سی لڑکی کے متعلق اتنا کچھ سوچ لینا ہی بہت تھا۔

جم نکولس اپنی جگہ پر واپس آ کر بیٹھ گیا۔ ٹیلیویژن اب بالکل خاموش تھی اور بے حرکت یہ وقت تھا جب اس کو اپنے شعبے کے طلبہ کے خصوصی سیمینار میں شرکت کے لیے تیار ہونا تھا۔

''سیمینار میری توقع سے زیادہ کامیاب رہا تم لوگ تو ضرورت سے زیادہ تیار تھے۔'' جم نے ٹریفک کے اشارے پر گاڑی روکتے ہوئے اپنی دونوں شاگردوں جنفر اور ویرا سے کہا جو اگلی ہی سیٹ پر ایک دوسری سے بالکل جڑی بیٹھی تھیں۔

''بھئی سیمینار ختم ہوا۔ اب میں سیمینار کے علاوہ ہر دوسری بات کرنے کو تیار ہوں۔'' جنفر نے تقریباً خشخشی بالوں والا سر جھٹک کر کہا تھا۔

''اور میں بھی اب سیمینار سے قطعی بور ہو چکی' اس کی تیاری نے مار ڈالا' اس کی تیاری کے لیے میں نے پورے ہفتے ایمانداری سے پڑھا ہے۔'' ویرا کی بھوری آنکھیں دردناک حد تک مظلوم نظر آ رہی تھیں اس کے بالکل سونے کے تاروں جیسے بال معصومیت سے اس کے شانوں پر لرز رہے تھے۔

کیا بات ہے ریشمی اور شربتی آنکھوں اور چمکدار بالوں کی موٹی سی چوٹی کی۔ جم نکولس نے ویرا کے سونے کے لچھے جیسے بالوں کو دیکھتے ہوئے سوچا اور وہ اپنے ذہن کی اس بے راہروی پر خود ہی ششدر رہ گیا۔

''یہ آج مجھے ہو کیا گیا ہے؟'' اس نے بڑی رازداری میں سوچا اور بولا۔ ''لیکن پھر بھی میگڈا کے آگے تمہاری ایک نہ چلی' اچھا ہٹاؤ۔''

''ہونہہ! پھر کیا ہوا اس کی میگڈا کی ساری دلیلیں تو ہربنس نے کاٹ دیں۔'' میگڈا کے متعلق ویرا کا لہجہ بالکل ولما کا سا تھا۔

چلو ہربنس' ہاشمی اور جیکسن کی ایک بات کا بھی جواب نہ دے پایا تھا۔'' جنفر نے فوراً کہا۔

لیکن اب ویرا کے منہ میں ببل گم کے بلبلے تیار ہو چکے تھے۔ منع کرنے کے باوجود بات مستقل سیمینار ہی پر ہو رہی تھی اور اب ویرا کے منہ کے بلبلے اس کو بولنے کی اجازت قطعی نہ دے سکتے تھے' چنانچہ طے یہ ہوا کہ جم نکولس اپنا کوئی اچھا اور پراسرار سا تجربہ سنائے۔

مشرق وسطیٰ کے شہر بیروت میں پانچ سال گزارنے کا مطلب تجربوں اور دلچسپ باتوں کا ایک طومار ہی تو ہوا نہ تھا' چنانچہ جب

جم نکولس کی مختصر سی گاڑی تقریباً نصف شب کے اندھیرے میں خاموش سڑک پر چلتی رہی اور وہ بیروت کے چھوٹے چھوٹے سے معمولی' لیکن دلچسپ تجربے ان کو بڑی خوش وقتی سے سناتا رہا اور پھر اسی دوران میں یہ بھی طے ہو گیا کہ پہلے وہ دونوں جم نکولس کے خوبصورت سے چپ چاپ کاٹیج میں چل کر کافی بنا کر خود بھی پئیں اور اس کو بھی پلائیں تب جا کر ان کو ان کی اقامت گاہ تک پہنچا دیا جائے گا اور یہ صلاح لڑکیوں کی عین مرضی کے مطابق تھی۔ اپنے کنوارے پروفیسر کے چپ چاپ تنہا کاٹیج میں جانے کے لیے اس کی شاگرد ہر وقت تیار رہتی تھیں۔

ایسے اکیلے اور سونے سونے سے گھر خاص اپنی ملکیت لگتے ہیں۔ سجے سجائے۔ ہر چیز موجود اور صفت یہ کہ مالک کی موجودگی کے باوجود خالص اپنی ملکیت معلوم ہوتے ہیں۔ جدھر چاہو اٹھو' بیٹھو اور آزادی سے چیزیں استعمال کرو' اور پھر سب سے بڑھ کر جی بھر کر چولہا چکی سنبھالو کوئی جلنے یا تعرض کرنے والا اور چیزیں پٹخ پٹخ کر اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے والا نہ ہوگا۔

وہ باتیں کر رہا تھا اور وہ دونوں چپ چاپ محتاط مسکراہٹوں کے ساتھ سن رہی تھیں۔ اس لیے کہ ان کے منہ بلبلوں سے بھرے پڑے تھے اور لب کشائی کی کوشش ہی میں پٹر پٹر پھٹ پھٹ کی آوازوں کے سوا کوئی لفظ نہ نکل رہا تھا۔

یہ نہ معلوم ہو سکا کہ بات کا رخ کب پلٹا' لیکن ہایوں کہ جب جم نکولس نے اپنی گاڑی گیراج کے قریب لا کر روکی تو وہ یہ کہہ رہا تھا۔

''اس لڑکی میں ایک اور بات بڑی عجیب تھی کہ جب مرد باہر سے گھر آتے' تو اس پر عجیب قسم کا انتظام اور ذمہ داری طاری ہو جاتی تھی اور کچھ نہیں تو گھبراہٹ اور انتظام کے مارے فرنیچر اور دوسری چیزوں کو ہاتھوں سے درست کرنے لگتی۔ بھئی میں تم سے صحیح کہتا ہوں اگر اس کا بس چلتا تو وہ آنے والوں کے کوٹ اتارنے اور جوتوں کے فیتے بھی کھولنے بیٹھ جاتی مگر خیر یہ نوبت کبھی نہ آ سکی۔'' جم نکولس یہ کہہ کر ہنس پڑا۔ ''اور ہاں جب اس کو احساس ہوتا کہ لوگ اس کی حرکتوں کو تعجب سے دیکھ رہے ہیں' تو وہ شرمندہ سی ہو کر اپنی جگہ پر جا بیٹھتی اور دونوں ہاتھوں کو یوں گود میں رکھ لیتی گویا ان کو یوں یہاں نہ رکھا' تو پھر کچھ نہ کچھ کرنے میں مصروف ہو جائیں گے' تاہم وہ یوں بیٹھے بیٹھے گھر کی عورتوں کی طرف بڑی معترض نظروں سے دیکھتی رہتی جو گھر کے مردوں کی آمد پر بدستور اپنے مشغلوں اور کاموں میں مصروف رہتیں اور ان کا استقبال ایک خفیف اور کبھی گرم جوش تبسم سے کر لینا ہی بہت سمجھتی تھیں اور ایک دن تو حد ہو گئی۔ ہوا یہ کہ مسز نکولس میرا مطلب ہے میری بھاوج۔۔۔۔۔''

پٹر پٹر پھٹ جنفر کے منہ کے اندر کا بلبل اچانک ہی پھٹ پڑا اور بالآخر وہ ہنس ہی پڑی۔ اس وضاحت کی کیا ضرورت ہے

ہمیں معلوم ہے کہ مسز نکولس آپ کی بھاوج ہی ہو سکتی ہیں آپ تو کنفرمڈ بیچلر ہیں۔'' اور جنفر کے استاد کو نہ معلوم کیوں ببل گم کی یہ آوازیں سخت ناگوار معلوم ہوئیں۔

''ہاں اور اس لڑکی میں ایک خاص بات یہ بھی تو تھی کہ اس کے منہ میں ببل گم جیسی نامعقول چیز کبھی نظر نہیں آئی۔''

ویرا اور جنفر کے استاد جم نکولس نے دل ہی دل میں سوچا تھا پھر سٹپٹا کر سلسلہ کلام منقطع کر دیا تھا اور اب بات جاری رکھنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ راستہ باتوں میں کٹ چکا تھا وہ گھر پہنچ چکے تھے۔

جم نکولس کا مختصر' خاموش اور کنوارا کاٹیج اپنی شدید تکان اور سر مغزنی کے بعد بے حد آرام دہ نظر آ رہا تھا۔ کافی تو بیٹھے بیٹھے پرفیور ہیٹر پر بھی تیار کی جا سکتی تھی' لیکن باورچی خانہ ہی تو عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ وہ ہنڈیا چولہا دیکھ کر اپنی ساری بلندیوں سے یوں پھسل پڑتی ہے جیسے گنبد پر سے اخروٹ' سارا فلسفہ اور ساری تھیوریاں دھری رہ جاتی ہیں اور خصوصاً گھروں کی زندگی کو ترستی ہوئی بورڈنگوں کی ماری یونیورسٹی کی طالبات کا بس اگر چولہے اور باورچی خانے پر چل جاتا ہے تو پھر کارگزاری دکھائے بغیر ان کا دل نہیں مانتا۔

چنانچہ فقط ایک کافی کا پانی پکانے اور ٹھنڈے گوشت کے سینڈوچز تیار کرنے کی خاطر وہ پورے کچن پر حاوی ہو گئیں اور ساتھ والے میں جم نکولس نے پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے برتنوں کی بے ضرورت دھر پٹخ اور نل کھولنے اور بند کرنے کی آوازوں کو سن کر محسوس کیا ہے کہ وہ خانہ داری کی لذت سے جی بھر لطف اندوز ہونے کی کوشش میں مصروف ہیں ساتھ ہی کام کے جوش اور زور میں سیمینار کا موضوع پھر چل پڑا تھا۔ پانی کی سائیں سائیں سی کی آوازوں کے درمیان جم نکولس نے سنا کہ ویرا ہاشمی کو سائنڈ کر رہی تھی اور جنفر ہربنس کی باتوں پر صاد کر رہی تھی۔

اوہ یہ ہاشمی اور ہربنس اس نے خالص استادوں والے انداز میں پیر پٹخے' یہ واہیات لڑکیاں ہمیشہ غیر ملکی لڑکوں کی سرپرست بن کر بیٹھ جاتی ہیں سی اور ان کی ہر ادا پر لوٹ ہوئی جاتی ہیں۔ جب ہی تو مقامی پروفیسروں کا یہ حال ہے کہ کنوارے ہی پڑے رہ جاتے ہیں۔ اس نے بے شمار شادی شدہ پروفیسروں کو نظر انداز کرتے ہوئے سوچا یہ لڑکیاں! جب تک ان کی ذہنیت درست نہیں ہوتی بھلے آدمی کنوارا ہی رہنا پڑے گا۔ اس نے مایوسی سے فیصلہ کیا اور اپنے بیچلر پن پر شاکر ہو کر پائپ کا لمبا سا کش لے لیا' اچھا تو اب کافی بننے میں کتنے گھنٹے اور باقی ہیں؟ وہ اکتا کر کچن میں آ گیا۔

''یہ ویرا نے پکا پکایا پانی فرش پر الٹ دیا۔'' بیچاری جنفر نے انتہائی پھوہڑ پن اور بے چارگی سے فرش کا پانی پونچھتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر میں انہوں نے باورچی خانہ الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔'' ارے یہ تم اتنی قابل لائق لڑکیاں! ابھی ابھی جب میں یہاں داخل ہوا تو تم ہندوستان اور چین کے جھگڑے کے متعلق امریکی پالیسی پر نکتہ چینی کر رہی تھیں اور دو پیالی کافی کا پانی بھی نہ پکا سکیں۔''

''دو کہاں تین چار پیالی'' ویرا نے ٹوکا۔

''تم سے تو اچھی وہ چھوٹی سی لڑکی تھی۔'' اس نے بلا تمہید ہی بولنا شروع کیا۔ ''ایک دن یہ ہوا کہ گھر پر صرف ولما وہ دونوں لڑکیاں اور میں رہ گئے تھے تو۔۔۔۔۔۔۔''

اچانک ہی جنیفر ہنس پڑی۔ ''سنا ہے اگلے سیمینار کا موضوع مقرر ہو چکا ہے۔''

''کیا؟'' ویرا نے چونک کر پوچھا۔

''یہی کہ طالب علموں کے باہمی تبادلوں میں غیر ملکی لڑکیوں کو بلانا خطرناک ہے۔''

''چلو ہٹو'' ویرا اس کی بات نہ سمجھ سکی۔

''توبہ یہ امریکی شاگرد لڑکیاں! ضرورت سے زیادہ بے تکلف اور منہ زور ہوتی ہیں۔'' اچانک ہی نکولس کو مشرقیوں کے تکلفات اور رشتوں اور مراتب کے ادب پر پیار آنے لگا۔ کس قدر سعادت مند ہوتے ہیں وہ شاگرد اور ہم امریکیوں نے تو بے تکلفی کا لبادہ اوڑھ کر زندگی میں بے شمار گھپلے پیدا کر لیے ہیں۔

جم نکولس کا منہ لٹک گیا تھا اور وہ خاموشی سے کافی کا سامان ٹرے میں رکھتا رہا' لیکن یوں اچانک بات کٹ جانے سے کوئی واقعہ ذہن کے پردوں سے محو تو نہیں ہو جاتا اور اس دن کی بات جس دن گھر پر ولما وہ دونوں لڑکیاں اور وہ خود رہ گیا تھا۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہ تھی بس یوں ہی کچھ زکام تھا ذرا گلا خراب تھا' کچھ طبیعت بھاری تھی اور بھاری سے بھی زیادہ نند اسی' نند اسی ہو رہی تھی۔ کھانے کا وقت ہو رہا تھا اور بھوک بھی خوب لگی ہوئی تھی۔ یوں تو کھانے کو سبزیوں کے' گوشت اور پھلوں کے بے شمار ڈبے' تازہ پھل اور پنیر ریفریجریٹر میں بھرے پڑے ہوئے تھے' لیکن اس کا دل گرم گرم تازہ پھل اور پنیر ریفریجریٹر میں بھرے پڑے تھے' لیکن اس کا دل گرم گرم تازہ کھانا۔ مثلاً سوپ یا روسٹ کی ہوئی' بھاپیں اٹھتی ہوئی مرغی کھانے کو چاہ رہا تھا۔ اس وقت کھانے کی اشتہا سے زیادہ اس کے دل میں یہ تمنا شدت سے سر اٹھا رہی تھی کہ کوئی کہ کوئی گرم گرم خوش ذائقہ کھانا اور کے پاس بیٹھ کر بڑی توجہ سے اس کو کھلائے' مگر وہ کون ہو سکتا تھا جب کہ بھاوج کلب میں مدعو تھی اور مددگار لڑکی جو گھر کی صفائی وغیرہ کرنے آتی تھی' دو دن کی چھٹی پر تھی اور تینوں لڑکیاں ٹیلیویژن دیکھنے میں مصروف۔ لڑکیوں کے خیال کے ساتھ ہی اس نے سوچا۔ ولما کو پکڑنا چاہیے۔ یہ لڑکی اتنی بڑی ہو گئی ہے

اور اب تک نکمی ہے۔

چنانچہ کرسی کے ادھر ادھر لٹکتی ہوئی گون کی ڈوریاں سمیٹ کر کمر کے گرد لپیٹتا ہوا وہ وہاں پہنچا۔

پکنے پکانے کا ذکر سن کر ہی ولما بکھر گئی تھی۔ ''کولڈ میٹ' پنیر اور سینڈوچز کی موجودگی میں کچھ اور پکانے کی کیا ضرورت ہے۔ انکل ڈارلنگ پھر کسی دن سہی آپ کی فرمائش کا کھانا۔''

اس نے ٹیلیویژن بند کر دیا تھا اور عذرا کے ساتھ اٹھ کر لیونگ روم کے کونے میں رکھے ہوئے ایکوریم میں ڈوبتی ابھرتی ہوئی سرخ' سنہری اور کالی مچھلیوں کا تماشا دیکھنے لگی تھی۔ مایوسی کے عالم میں کھڑے کھڑے جم نکولس نے محسوس کیا کہ وہ چھوٹی سی مختصر ریشمی آنکھوں والی لڑکی ہمیشہ کی طرح بے چین سی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ شاید وہ اس خیال سے کہ گھر کر مرد اور وہ بھی جس کا بزرگوں میں شمار ہے' بھوکا کھڑا ہے۔ بے کلی سی ہو کر کسمسائی اور مارے انتظام کے جلدی سے سر پر دوپٹہ لے لیا۔ جھجکتی ہوئی اسی آگے بڑھی اور دھیرے سے بولی۔ ''انکل جم' اگر آپ کوئی خیال نہ کریں' تو میں پکاروں آپ کے لیے کوئی چیز۔''

وہ جو یوں بھی بہت لمبا تھا اس کے مقابل خود کو اور بھی زیادہ لمبا اور بے ڈول محسوس کرنے لگا تھا۔ یہی بات اگر ولما یا عذرا جیسی لمبی چوڑی ہٹی کٹی لڑکی کہتی تو وہ خوشی خوشی منظور کر لیتا' مگر یہ تو بہت چھوٹی اور مختصر سی لڑکی تھی بالکل جیسے ننھی سی ڈری ڈری کالی آنکھوں والی چوہیا۔

وہ دل ہی دل میں ہنسا اور اس کی طرف جھک کر بولا۔ ''تو کیا یہ واقعہ ہے کہ تم بھی کچھ پکا سکتی ہو؟''

''ہاں انکل میں دو چار چیزیں تو یقیناً پکا سکتی ہوں۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جیسے آپ مجھے بتا دیں گے اسی طرح پکا دوں۔''

اور اب وہ ظاہر طہور ہنس رہا تھا۔ ''اور اچھا اگر میں یہ کہوں کہ مجھے تو سرے سے پکانا آتا ہی نہیں تم اپنا پاکستانی کھانا پکاؤ تو۔''

''ہاں ایک بات یہ بھی ہو سکتی ہے۔'' اس کی کالی آنکھیں سنجیدہ تھیں اور لب بڑی سادگی سے مسکرا رہے تھے۔

''تو پھر تم کیا کیا پکا لو گی؟''

''م میں۔۔۔۔'' وہ اٹکی۔ ''آلو کی سبزی'' اس نے خود اعتمادی سے کہا۔

''اور؟''

''اور۔۔۔۔اور مٹر پلاؤ بھی۔'' اس مرتبہ لہجہ سٹپٹایا ہوا تھا۔

''اور کچھ؟''

''ہوں!'' اس نے سوچا اور بالکل ہی مری ہوئی آواز میں بولی۔ ''شاید مرغی کا قورمہ بھی پکالوں۔''

''اچھا تو مرغی کا قورمہ اور مٹر پلاؤ پکاؤ۔''

وہ اچانک ہی ڈر سی گئی۔ ''تو کیا آپ کے پاس چاول' مرغی اور مٹر سب چیزیں موجود ہیں؟'' اس نے بے اعتباری سے پوچھا۔

دو ہفتے یہاں گزار لینے کے بعد بھی ابھی تک وہ یہاں کی سہولتوں اور فراوانی پر پوری طرح ایمان نہ لا پائی تھی۔

''بالکل ہر ایک چیز موجود ہے سوائے ایک پکانے والی کے۔'' وہ اس کی طرف اور بھی زیادہ جھک کر مسکرایا۔ ''اور اب ایک چھوٹی سی پکانے والی بھی مجھے مل گئی ہے۔''

باورچی خانے میں جب وہ اس کے ساتھ ساتھ کام کر رہا تھا تو اس پر عجیب عجیب انکشاف ہوئے تھے۔ مثلاً یہ لڑکی بہت زیادہ ذہین اور اپنی عمر کے لحاظ سے اچھی خاصی پڑھی لکھی' لیکن بیوقوفی کی حد تک سادہ مزاج تھی۔ مثلاً ایک دم ہی کوکنگ رینج اور مصالحہ پیسنے کی مشین کو دیکھ کر خوفزدہ سی ہوگئی تھی۔ ''بھئی انکل یہ آپ کی مشین' میں کس طرح ان سے کام لوں گی۔''

''تم میری مشینوں کی پرواہ نہ کرو۔ مشینوں کا جن یہ رہا مائی ڈیئر گرل۔'' اس نے اپنے سینے کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ ''تم صرف حکم دو۔''

وہ خوش دلی سے کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''اچھا تو حکم یہ ہے کہ اس کو پیس دیجئے۔'' اس نے لہسن' پیاز اور ادرک کے ٹکڑے اس کے حوالے کر دیئے۔

پلک لگنے کی دیر تھی کہ شرشرشوں کی آواز کے ساتھ سرمے کی طرح باریک مصالحہ تیار تھا۔

''ارے اتنی جلدی اتنا نفیس مصالحہ پیس لیا' کمال کیا۔'' اس کی نگاہوں میں شاباشی تھی۔

''خیر یہ تو اس مشین کا کمال ہے' کیا خیال ہے تمہارا اس مشین کے متعلق؟''

''بس بالکل پریوں کی کہانیوں والی چھڑی ہے جادو کی۔''

''ہاں تو بس اب تیار ہو جاؤ یوں سکھاؤں گا ساری مشینیں چلانا۔'' اس نے چٹکی بجائی۔

''میں کیا کروں گی یہ سیکھ کر۔'' اس نے قناعت سے سر جھکا لیا۔

''انکل ہم تو پتھر کے سل بٹے پر یا لنگری میں پیس لیا کرتے تھے۔''

''تو تم ابھی پتھر ہی کے زمانے میں ہو حابیبہ''

''انکل میرا نام حبیبہ ہے۔'' اس نے جلدی سے درست کیا اور اس کی بات کا جواب ٹال گئی۔

وہ بھی ٹال گیا۔ ''حبیبہ تمہارے نام کے کیا معنی ہیں؟''

میرے نام کا مطلب ہے۔'' وہ جسے چاہا گیا۔''

اس کی آواز نرم اور ریشمی تھی۔ اس کی محفلیں آنکھوں میں طمانیت اور آسودگی تھی جیسے اس کا یقین ہو کہ وہ اسم بامسمی ہے اور اس کو ہر کوئی چاہنے لگتا ہے۔ جیسے وہ کہتی ہو انکل مشینوں کے میسر نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے' اصل چیز تو محبت کی فراوانی ہے۔

''حبیبہ تم انگریزی بہت اچھی بولتی ہو۔''

اس نے انکسار سے سر جھکا لیا۔ اس کی اس عادت پر تو وہ دل ہی دل میں شروع ہی سے یوں لوٹ تھا جیسے اس کی یہ شاگرد لڑکیاں جیفر اور ویرا یعنی جن کو اس جگہ کھڑے کافی بناتے مدت گزر گئی ہے۔ ہاشمی اور ہربنس پر فدا تھیں۔ اچانک ہی اس کو غصہ آ گیا ان دونوں پر اور وہ کافی کی پیالیاں ٹرے میں سجی چھوڑ کر سٹنگ روم میں آ بیٹھا۔ شام کو جو پردے اپنی الجھن میں اس نے سرکا دیئے تھے وہ ابھی سرکے ہوئے تھے۔ شفاف نیلگوں شیشوں میں سے ماہ تمام مسکرا رہا تھا اور سیاہی مائل نیلا آسمان اس کو اپنے محیط میں لیے ہوئے نظر آ رہا تھا۔ ایسے لمحات کالی کالی آنکھوں والی سہمی سہمی چھوٹی چوہیا جیسی لڑکیوں کے تصور میں صرف کرنے کے لیے نہیں ہوا کرتے' مگر اس کا بھی کیا علاج کہ بعض تصورات حد درجہ اڑیل ہوتے ہیں۔ جم نکولس کے ذہن نے گویا طے کر لیا تھا کہ اس دن کی بات کا جس کو ویرا اور جیفر نے سننے سے انکار کر دیا تھا اور جس کی تمہید ہی سن کر مذاق اڑانے بیٹھ گئی تھیں' اس کا اعادہ کر کے رہے گا۔

اس کو پتہ بھی نہ چلا تھا کہ اس لڑکی نے کس چیز میں کس وقت کیا چیز ڈالی تھی۔ اور کون سا مصالحہ ڈالا۔ اب تو کچن کے علاوہ گھر بھر میں اشتہا انگیز خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایسی کہ ولما دوڑتی ہوئی پہنچ گئی تھی۔

''ارے' ارے انکل کیا پکا ڈالا' دونوں نے مل کر؟''

اور حبیبہ نے مٹر پلاؤ کے ساتھ کھانے والی دہی میں لہسن' مرچ کا نٹے کے ساتھ ملا کر پھینٹتے ہوئے کہا۔

''میں نے کبھی اپنے آپ سے آلو کی سبزی کے سوا کوئی چیز نہیں پکائی تھی۔ البتہ پکانے والوں کی مدد اکثر کی تھی۔''

کھانا ختم ہونے کے بعد ایک کام کرنے والی کو مستعد پا کر ولما اور عذرا اپنی اپنی پلیٹ صاف کر کے باغ میں سرک گئی تھیں اور

حبیبہ نے مٹر پلاؤ اور مرغی کے خالی برتن سنبھالتے ہوئے ماہرانہ انداز میں بتایا تھا کہ ہمارے کھانوں میں صرف ایک خرابی ہے کہ برتن بہت چکنے ہو جاتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ جب وہ چھوٹی سی لڑکی سنک کے پاس کھڑی برتن صاف کر رہی تھی تو اس ضرورت سے زیادہ لمبے پینتالیس سالہ شخص کے ذہن میں کبھی بچپن کے یاد کیے ہوئے ننھے منے مختصر سے بول گونج رہے تھے۔

''گھونگریالی زلفوں والی لڑکی

کیا تم میری بن جاؤ گی''

پھر تم کو پلیٹیں دھونے کے بجائے۔۔۔۔۔۔۔

اچانک ہی اس کا دل واقعی اس لڑکی سے کچھ پوچھنے کو چاہنے لگا جس نے اس کی شدید بھوک کے عالم میں بڑی توجہ سے خوشبودار اور گرم گرم کھانا کھلایا تھا۔ یہ مہربان اور حد درجہ خیال کرنے والی لڑکی اب اتنی چھوٹی تو نہیں معلوم ہو رہی تھی لیکن وہ تو اس سے یہ تک نہ پوچھ پایا تھا کہ تم کو یہ کچن اور ساری مشینیں پسند ہیں۔ اس لڑکی سے یہ سوال کرنے کی اسے ذرا بھی ہمت نہ ہوئی جو لنگری یا سل بٹے پر مصالحہ پیس رہی تھی حد درجہ مطمئن اور قانع تھی اس لیے کہ اس کے نام کے معنی تھے۔ ''وہ جسے چاہا گیا''

اور وہ کو واسم بامسمی تھی۔

''حبیبہ''

''یس انکل!'' اس نے چونک کر سعادت مندی سے سر اٹھایا۔

''ارے تم مجھے انکل کیوں کہہ رہی ہو۔ یعنی تم جس نے ایک پوری بڑی عورت کی سی سنجیدگی اور توجہ سے مجھے میری خواہش کے مطابق گرم اور مزے دار کھانا کھلایا۔'' اس نے کہنا چاہا' لیکن اتنا معصوم نظروں اور سعادت مندی کے آگے کچھ کہا یا پوچھا بھی کیا جا سکتا تھا۔ مجبوراً اس کو اپنا سوال بدلنا پڑا۔

''تم جب یہاں سے جاؤ گی تو تم کو کیسا لگے گا؟''

''آپ جب بیروت سے واپس آئے تھے تو آپ کو کیسا لگا تھا؟'' حبیبہ نے بھی سوال کیا۔

''میرا مطلب ہے جب تم یہاں یعنی امریکہ سے اپنے وطن پہنچو گی تو تمہارا ردعمل کیا ہوگا؟''

وہ اس کے سوال کا مطلب پہلے بھی سمجھ چکی تھی۔ پلیٹ پر چلتے چلتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے ایک لحظہ ٹھہر کر جم نکولس کو

دیکھا تھا اور اسی لمحے جم نکولس کو یہ احساس ہوا تھا کہ صداقت اس لڑکی کی ایک صفت ہے۔

وہ اچانک ہی افسردہ ہوگئی۔

''میرا تاثر کیا ہوگا۔ میں آپ کو کس طرح بتاؤں۔'' شاید اس کو الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

کچھ دیر وہ خاموش رہ کر بلا تمہید ہی اس سے مخاطب ہوئی۔

''انکل آپ کو ایک بات بتاؤں؟''

''ضرور'' جم نے بے دلی سے کہا۔

''میرے یہاں آنے کا قطعی کوئی چانس نہ تھا اور شاید سلیکشن بورڈ کے ممبروں سے کوئی چوک ہوگئی تھی اور شاید خود ہمارے کالج کی پرنسپل نے بھی کسی غلطی کے ماتحت ہی میرا نام اور میرے متعلق ریمارک بھیج دیا کہ اگر انتخابات کا کام میرے ذمہ ہوتا تو میں ایسی لڑکیوں ہی کو منتخب کرتی۔

''آپ کو شاید میں نے بتایا بھی نہیں کہ ہم تو ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے ہیں' بالکل ہی معمولی طرح۔'' ایک دم وہ ہنس پڑی۔ ''اور آپ کبھی اندازہ ہی نہ کر پائیں گے کہ کتنی معمولی طرح۔ پر ایک بات ہے کہ میری پھوپھی کا گھرانا ہم سے بہت مختلف ہے۔'' حبیبہ نے رک کر صاف کی ہوئی پلیٹ کو خشک ہونے کے لیے رکھ دیا اور دوسری پلیٹ اٹھالی۔ تب جم نے اکتا کر سوچا تھا۔ اف کتنی بے ربط باتیں کرنے لگی یہ لڑکی اچانک ہی۔

لیکن حبیبہ کی ہمیشہ کی طرح نرم اور ٹھہری ہوئی آواز سنائی دی۔ ''اور جب ہم اپنی پھوپھی کے گھر جا کر واپس آتے تھے تو عجیب سا احساس ہوتا۔ اچھے خاصے بلب جو عام طور پر روشن نظر آتے تھے وہاں واپسی پر ٹمٹماتے ہوئے دیے معلوم ہوتے تھے' دیواریں اور کمروں کے دروازے ہمیشہ سے زیادہ دھیلے' افسردہ اور خاک آلودہ معلوم ہونے لگتے۔ چھوٹا سا مختصر صحن' بے حد خاکستری' ویران اور گھٹا گھٹا محسوس ہونے لگتا۔ ہم سب پر بے وجہ ہی جھنجھلاہٹ طاری ہوجاتی اور کئی دن یہ رہتا کہ بلا سبب ہی ایک دوسرے کو الزام دیا کرتے۔ وہاں سے واپس آ کر نظر میں ان کے روشن اور سجے ہوئے کمرے' چرچر بولتی ہوئی سرخ مورم والے راستے اور سرسبز لان سمائے رہتے۔ پھر رفتہ رفتہ غصہ آپ ہی آپ ٹھنڈا پڑ جاتا اور ہم اپنے چھوٹے سے بالکل معمولی سے گھر میں مگن ہوجاتے۔ مگر اب ایسا نہیں ہوتا۔''

''تو کیا تم نے وہ گھر چھوڑ دیا؟'' جم نکولس یہ سوچ رہا تھا کہ لڑکی بات کا اصل جواب کس صفائی سے گول کر جاتی ہے۔

''نہیں انکل گھر تو وہی ہے' مگر ہم نے پھوپھی کے گھر جانا چھوڑ دیا۔''

''تو اس سے میری بات کے جواب کا کیا تعلق ہے؟'' اس نے حبیبہ کی بات کو سمجھ کر بھی سوال کیا۔

''یہی کہ ہمیں بلاضرورت آپ کے ملک میں۔۔۔۔۔۔''

''ہائے میرا کاکا تو' ہائے میرا بے چارہ کاکا تو'' ولما نے اچانک ہی شور مچا دیا۔

وہ کاکا تو اتو بچا لیا گیا' مگر بلی اس کو بری طرح زخمی کر گئی تھی۔

اور بال آخر کافی تیار ہو کر آ گئی جس کے انتظار کی وحشت میں وہ اتنا کچھ سوچ رہا تھا۔

مگر یہ دونوں لڑکیاں ویرا اور جیفر بھی کتنی خوش قسمت اور دلچسپ ہیں۔ خصوصاً ویرا کا ہر کام میں انہماک خواہ پڑھائی ہو یا پیالیوں میں کافی انڈیلنا' اپنے بے ڈھنگے پن کے باوجود اس کا پرخلوص انہماک اور محویت بہت ہی دلچسپ چیز تھا' اور جیفر کا نستعلیق پن۔ اچھی تھس ی اس کی یہ دونوں شاگرد لڑکیاں' خصوصاً ایسے بوریت کے موقعوں پر ان کو بشاش کر دیا کرتی تھیں۔ اپنی اپنی پسند کے مطابق چند ریکارڈ سننے کے بعد انہوں نے نکولس کا ٹیپ ریکارڈر سننے کی فرمائش کی اور اس کا ٹیپ بھی ایک معجون مرکب تھا' بیروت یونیورسٹی کے ٹیپ کے ہوئے بھانت بھانت کے نغمے اور رنگ رنگ کی آوازیں اور بولیاں' عربی نغمے' فارسی غزلیات اور رباعیاں' ہندی بھجن' فرانسیسی اور جرمن گانے' پنجابی ٹپے' بنگال کے مانجھیوں کا گیت۔

''ارے' یہ تو بالکل ہربنس کی طرح گا رہا ہے۔'' جیفر نے نیم باز آنکھوں سے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اونہہ!'' جم نکولس کا دل جل کر کباب ہو گیا۔

اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ ناتمام ٹیپ بدل دی اور اب ایک رسیلی مدھ بھری ٹھہری ٹھہری آواز جیسے خوابوں کی بستی میں گنگنائی ہو۔

اے دل کے نصیب ہے توفیق اضطراب

جم نکولس نے جیفر کی طرف فاتحانہ دیکھا' گویا کہا ہو اب ملاؤ تم اپنے ہربنس کی آواز سے اس آواز کو۔

اچانک ہی ویرا کا ہاتھ اٹھا۔ ''پھر سے' میں اسے پھر سے سننا چاہتی ہوں۔''

دھیرے دھیرے بہتی ہوئی مدھر آواز دوبارہ گنگنائی۔

اے دل کے نصیب ہے توفیق اضطراب
ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی

صرف آواز ہی کے تاثر نے ویرا کی آنکھوں کو نمناک کر دیا۔

''اور اب اس کا مطلب بھی تو سنو۔'' وہ فخریہ بولا۔

نرم نرم ریشمی آواز نپے تلے الفاظ میں اس کا مطلب بیان کر رہی تھی' جیسے موتی پرو رہی ہو۔

جم نکولس نے پائپ ہاتھ سے رکھ دیا تھا۔ اس کے چہرے کا روٹھا روٹھا کرخت تاثر پگھلتا معلوم ہو رہا تھا۔

ہاشمی بھی یہ بول کتنی اچھی طرح گاتا ہے' ویرا کی آواز بھی بھیگ رہی تھی۔ پر اس نے اس کا ترجمہ کبھی نہیں بتایا۔ بڑا نان سیریس ہے۔

''اوہ' یہ ہربنس اور ہاشمی۔ یہ کم بخت غیر ملکی لڑکے'' نکولس نے پائپ اٹھا لیا تھا۔

''حبیبہ' وہ جسے چاہا گیا''

ٹیپ کے اختتام پر چھوٹی سی نرم آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی ننھی سی تنہا نقرئی گھنٹی بج اٹھی ہو۔

''وہ جسے چاہا گیا'' ٹیپ نے تکرار کی۔

اوہ! یہ کم بخت غیر ملکی لڑکیاں۔۔۔۔۔۔۔ ویرا اور جیفر نے ایک ساتھ سوچا۔

''چلو میں تم کو تمہارے ٹھکانے پر پہنچا دوں۔'' اس کی جھنجھلائی اور روٹھی ہوئی آواز اپنے دونوں شاگردوں سے مخاطب تھی۔

◆◆◆

کہیں یہ پروائی تو نہیں

تین سو پینسٹھ دنوں کا بھاری بوجھ ایک بار پھر حال کے ہاتھوں سے پھسل کر ماضی کے اندھیارے غار میں جا گرا ہے۔

اس اجاڑ سے کمرے کی کھڑکیاں چوپٹ کھلی ہیں' گہرے سبز درختوں کے عقب میں سرمئی بادلوں میں لپٹا ہوا آسمان کتنا عجیب نظر آ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی نے خلائی فضاؤں میں بڑا سہانا اور دکھی دکھی سا حسن بکھیر دیا ہے۔ بڑی تپش اور جلا کن کے بعد ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔

''کہیں یہ پروائی تو نہیں؟''

میرے آگے میز پر کاغذوں اور کتابوں کا بے ترتیب ڈھیر ہے میں نے لکھتے لکھتے ہاتھ روک لیا ہے اور اپنا قلم بند کر کے گلے میں لگا لیا ہے۔ اس لیے نہیں کہ رت سہانی ہے اور انگور کی بیل پاگل پن حد تک خوبصورت نظر آ رہی ہے اور ایسے سمے انسان ڈیری فارمنگ پر کتاب نہیں لکھ سکتا۔ وہ دودھ کے کیمیاوی اجزاء اور مویشیوں کی خوراک میں سرسوں کی کھلی اور بھوسے کے اجزا کی اہمیت پر بحث نہیں کر سکتا ہے۔ ہاں ٹھیک ہے میں اس وقت گائے بھینسوں کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھوں گی۔

اور بات یہ ہے کہ میں بڑی بے دھیان ہوں قلم گلے میں لگا ہوتا ہے اور میں سارے میں ڈھونڈتی پھرتی ہوں۔ بہت بار کے دیکھے ہوئے چہرے دیکھ کر سوچا کرتی ہوں۔ یہ کون ہیں؟ میں نے تو ان کے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میرا حافظہ اتنا خراب ہے کہ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ کس نے مجھے دکھ پہنچایا ہے اور کس کے متعلق یہ طے کیا تھا کہ اس سے ہمیشہ خفا رہنا ہے۔ اور جس دن مجھے کوئی بہت ضروری کام کرنا ہوتا ہے تو اس دن کوئی اور ہی اور بہت ہی واہیات سا پروگرام بنا کر بیٹھ جاتی ہوں۔ ہاں تو بھئی میرا کیا ٹھیک ہے کبھی ایسا نہ ہو کہ میری یادوں کے نگر ویران اور ڈھنڈار رہ جائیں اور ساری جانی پہچانی باتوں کو سرے سے پہچان ہی نہ پاؤں اسی لیے تو میں نے کاغذ ڈال دیئے ہیں اور قلم گلے میں لگا لیا ہے۔ اسی لیے کہ میں چاہتی ہوں کہ ذرا پیچھے کی طرف ٹیک لگا کر آنکھوں کو چندھیا کر دور افق کی اور تاک کر تو دیکھوں۔ کیا خبر ماضی کے بے کراں راستوں پر جاتا ہوا وہ وقت مڑ کر پیچھے دیکھ ہی لے۔

ارے ہاں خوب وہ دیکھو گئے ہوئے وقت نے پلٹ کر مجھے پکارا ہے۔ اور اب میرے سامنے سے گرد و پیش کا ہر منظر تحلیل ہو رہا ہے اور خلاؤں میں سے وہ کھویا ہوا افق نمودار ہو رہا ہے' ہاں یہ بڑا اچھا ڈھاڑ سا پھاٹک وہی تو ہے جس کی لوہے کی سلاخوں سے چمٹ کر ہم

پہروں جھولا کرتے تھے۔ ٹکٹ بنتے اور بیچے جاتے گارڈ ہری جھنڈی دکھاتا اور سواریاں ریلنگ پر پیر جما کر سلاخوں سے چمٹ کر ریل کی سواری کرتے اور باقی کے لوگ اس کو زور سے باہر کی دھکیل دیتے تھے' باہر کو سڑک چلتی تھی اور پھاٹک کے بالکل سامنے کو لوہار کی بھٹی دہکتی تھی۔ سرخ سرخ لوہا جھن جھن' ٹھن ٹھان کر کے پیٹا جاتا تھا۔ اندر کو جاتے تھے تو بڑے اور چھوٹے باغ۔ نربسی کی باڑھ اور گلاب کی بیلیں چڑھے ہوئے نازک گیٹ نظر آتے اور ہم فرض کر لیتے کہ گاڑی جنگلوں اور کھیتوں سے گزر رہی ہے۔ جب گاڑی کو اسٹیشن میں داخل کرنا ہوتا تو انگوٹھا ٹھوڑی کے نیچے اور شہادت کی انگلی ناک کی سیدھ میں ماتھے پر چپکا لیتے اور انگوٹھے اور انگلی کی گھاٹی سے ہونٹ جما کر پوری طاقت سے چیخ مارتے۔ کوداودو اور بالکل ہوتا کہ گاڑی اسٹیشن میں داخل ہو رہی ہے۔

گرمی کی ساری چھٹیاں یوں ہی پھاٹک کے دروازوں پر جھولتے اور سمر ہاؤس کے اندر مار دھاڑ سے بھرپور کھیل کھیلتے گزر جاتیں' ڈاکو پکڑے جاتے اور پولیس اور ڈاکوؤں میں بڑی زبردست جھڑپیں ہوتیں اور پھر ایک دم ڈاکو توبہ کر کے کچے امرودوں اور شہتوتوں کی دکانیں لگا لیتے۔ گملے پھوڑ پھوڑ کر اور گھس گھس کر سیر آدھ سیر کے بٹے اور سکے بنائے جاتے اور بس یوں ہی کھیلتے کھیلتے ایک دن معلوم ہوتا کہ بس چھٹی ختم کل سکول جانا ہے اور اس کل والے دن ہم نو بجے تک مکر کئے پڑے رہتے۔ سکول کی بس آ کر پلٹ جاتی' لیکن تا بکے۔ پھر دوسری کل چار بجے رات سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا لیا جاتا۔ پھر ہر بار جب اسکول کھلتا' تو ایک نہ ایک نئی مصیبت ساتھ آتی۔ اور اس مرتبہ یہ آئی کہ ایک نئی موٹی سی صاحبہ کلاس میں آئیں۔ بغیر کور کی ساری باندھے اور عینک لگائے۔ انہوں نے کلاس کی مسلمان لڑکیوں کو ہندی کے قاعدے دیئے اور کہا کہ اس کے صرف سیکھ کر آنا۔ یہ کتاب دیکھ کر میں برا مان گئی۔ پانچویں کلاس میں ہو کر ہم یہ قاعدہ کیوں پڑھیں۔ ایک بار تو ایسا ہی قاعدہ پڑھ چکے تھے۔ ساری تصویریں وہی بنی تھیں۔ خیر انہوں نے بتایا تھا کہ پانچویں جماعت میں ہندی ضرور پڑھنا ہے اور ہم نے اس کو بستے میں احتیاط سے رکھ دیا اور وہ پڑا رہا۔ دو دن کے بعد وہ پھر آئیں تو ہم نے بڑے اطمینان سے سنا دیا۔ الف سے انار' بے سے بکری' ح سے حقہ اور ڈ سے ڈھول۔ پاگل' دیوانی۔۔۔۔۔۔۔ وہ غصے سے بے حال ہو گئیں۔ پھر سے سیکھ کر آؤ۔

بھئی یہ کیا مصیبت ہے' مگر کون بتاتا' کلاس کی ساری لڑکیاں ہم سے دو دو ہاتھ اونچی تھیں وہ خالی گھنٹوں میں بیٹھ کر کروشیا کی لیسیں اور لال سبز اونوں کے سویٹر بنتی تھیں۔ ہم ان سب سے شرماتے تھے اور ٹوٹی چوڑیاں اور گولیاں کھیلا کرتے تھے۔ اس لیے کتاب پھر رکھ لی اور سوچا یہ خود ہی پاگل ہیں۔ صاف صاف تو حقے اور بکری کی تصویر بنی ہے اور یہ برا مانتی ہیں' مگر جب ہر بار پھٹکار پڑنے لگی تو ہم نے اماں سے رجوع کیا۔ وہ خود تو پڑھاتی نہیں کہتی ہیں گھر سے سیکھ کر لاؤ۔

''تم ربی دت سے کہو وہ تم کو پڑھا دے گا۔'' اماں نے مشورہ دیا۔

اور پھر ہم نے اس لڑکے کی خوشامدیں شروع کیں جس کے باپ کو ہم مہاراج کہا کرتے تھے وہ باہر کوٹھڑیوں میں رہتا تھا۔

ربی دت نے بڑی بڑی آنکھوں میں موٹا موٹا کاجل اور ماتھے پر نظر کا بڑا سا کالا ٹیکا لگائے' کالے ڈورے میں پرویا ہوا سونے کا تعویذ پہنے' آنکھیں مٹکائیں اور اپنی شرائط پیش کیں۔

''تم ہماری چٹیا تو نہیں کھینچو گی؟''

''نہیں''

''جھولا جھولنے دو گی؟''

''ہاں''

''بیس جھونٹے دو گی؟''

''ہاں''

''گوس روٹی کھلاؤ گی؟''

اور یہاں ہم سٹپٹا گئے۔ ہم اس کی فرمائش پر اس کو گوشت کھلاتے تو اماں ناراض ہوتیں۔ خبردار جو اس کو گوشت دیا ہے کبھی۔

''مت کھلاؤ ہم بھی نہیں پڑھاتے۔''

''کھلائیں گے۔''

اور ان کی تشریف آتی تو گھس کر پلنگ یا تخت کے نیچے بیٹھ جاتے۔ پھر گھسیٹ گھساٹ کر نکالتی تو بڑے رعب سے فرماتے' پڑھو۔ چھوٹا آ' بڑا اوای۔ سارے تصویروں والے ورق دل لگا کر پڑھا دیئے۔

پھر ایک دن پڑھایا۔ موہن اچھا لڑکا ہے۔ بھور بھئے جاگتا ہے اور اشنان کرتا ہے۔ بھئی مجھے یقین نہ آیا کہ اتنے اجنبی حرفوں میں سے اتنے مانوس بول نکل سکتے ہیں۔

''کم بخت گدھا پڑھاتا نہیں' ٹھیک سے۔''

''پڑھائے تو رہے ہیں اور کا تمرا سر پڑھائیں؟''

جھوٹا مکار' انگریزی میں سے انگریزی کی آواز نکلتی ہے اور تو ہندی میں اردو پڑھا رہا ہے۔ ''جاؤ ہم نہیں پڑھاتے۔'' وہ میدان

چھوڑ کر بھاگ نکلتا کیوں کہ یہ معاملہ خود اس کی سمجھ سے بالاتر تھا ہندی میں سے اردو کی آواز کیوں نکلتی ہے۔

بڑی مشکل سے اس بات سے سمجھوتا کیا کہ ان عجیب وغریب اور بالکل ہی نئے حرفوں میں سے وہی آوازیں نکلتی ہیں جنہیں ہم اردو میں پڑھا کرتے ہیں۔

اب لکھائی شروع ہوئی۔ یہ یہ کیا لگی ہے او کے اوپر پھچیا سی میں ماترا کو دیکھ کر پوچھتی۔

اور پھر وہ گڑبڑا جاتا۔ یہ ایسے ہی ہے تم اس سے مت بولو اپنا کام کرو۔

غرض اس نے ماترائیں نہ بتانا تھیں نہ بتائیں۔

میرے دل میں ایک الجھن سی رہی' یہ کیا دھاندلی ہے۔ کہ وہی بات اردو میں پڑھو وہی ان عجیب وغریب حرفوں میں پڑھو۔ ضرور کوئی سازش ہے پڑھنے والوں کو پریشان کرنے کے لیے طبیعت ضد یا سی گئی۔ بے کار کون سر مارے اور ربی دت بھی میری روز کی جھک جھک سے تنگ آ چکا تھا۔ ہم نے ہندی کا قاعدہ ایک طرف ڈال دیا۔ ایک یہ بھی بات تھی کہ اب ہم ایک ایسے سکول جانے والے تھے کہ جس میں جھگڑا ہی نہ تھا۔ اور یوں وہ استادی شاگردی کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اور اب وہ دن بھر نظر نہ آتا۔ سکول جاتا اور وہاں سے آ کر واہی تباہی پھرتا۔ یا پھر گھر میں بیٹھ کر بڈھوں کی سی باتیں کرتا اس لیے کہ اس کا کوئی بھائی بہن نہ تھا اور سارے رشتے دار وطن میں تھے۔

ہاں تو بھئی ربی دت تم خوب تھے اور اب اس وقت بھی اس تمام پس منظر میں بالکل نظر آ رہے ہو۔ اور ہمیشہ ہی نظر آتے ہو۔ جب برکھا رت آتی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آتا ہے کہ وہاں جہاں گھر تھا' گھٹائیں جھوم کر آتی ہوں گی اور جھڑی لگ کر پانی برستا ہوگا۔ اولتیوں سے پانی کے شرائے چلتے ہوں اور لوگ سلونو مناتے ہوں گے تو پھر مجال ہے جو تم یاد نہ آؤ۔ جب میرے اور تمہارے درمیان استادی اور شاگردی کا رشتہ ٹوٹ گیا تو تم نے ایک دوسرا رشتہ یوں جوڑا کہ دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر اپنی بیٹھی بیٹھی سی آواز میں رٹ لگا دی۔ ''تم کیسی بہنی ہو' تم ہمرے راکھی بھی ناہیں باندھت ہو۔'' اوروں کی بہنیں تو بھیا لوگن کے راکھیاں باندھت ہیں۔''

جب سارے دن تم نے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دروازے کی اوٹ میں چھپ چھپ کر اور راکھی نہ باندھنے کے طعنے دے دے کر ناطقہ تنگ کر دیا تو پھر اماں نے ہم لوگوں کو تمہارے لیے راکھیاں منگا کر دیں اور پھر جو تم دروازے کے پیچھے آ کر چھپے تو پکڑ کر تمہارے ہاتھ میں وہ لال سبز ڈوروں اور پھندنوں والی راکھیاں باندھ دی گئیں۔ اپنے ہاتھوں میں تین تین راکھیاں دیکھ کر تم خوشی کے

مارے گھر بھاگ گئے اور اس شام سفید جھاگ سی دھوتی' لیس والا کرتہ اور گاندھی کیپ لگائے پیتل کے تھال میں چاول' اندرسے اور کیلوں کے ساتھ آٹھ دس آنے پیسے رکھے تم آئے اور اسی دروازے کی آڑ سے ہاتھ بڑھا کر تھال رکھ دیا اور بولے۔ ''یہ تمہاری وچھنا ہے۔''

کیا کہنے تھے تمہارے' یہاں کسی کو راکھیاں باندھنے کا ہوش اور شوق تھا' مگر تم ہر سال سلونو پر پہلے ہی سے یاد دلانا شروع کر دیتے۔ ''راکھی منگائے لی ہمری۔''

اور تمہارے دل میں یوں زبردستی کا بھیا بننے کا کتنا احترام تھا۔ بی جب شادی کے بعد پہلی بار شملے سے آئیں تو تم باہر سے ان کا بستر اپنے اوپر بڑی مشکل سے لاد کر لائے۔ اور جب تم سے کہا گیا کہ بھئی تم کیوں لائے جبل اٹھالاتا۔ تو تم چپکے سے بولے کیوں لے آتا' جبل' آپا کے دولہا جو کہنے لگے تھے کہ یہ کیسا بھیا ہے تمہارا جو ایک بستر بھی نہیں اٹھا سکتا۔

اور اسی پر بس نہیں تھا۔ تم عجیب ہی تھے لڑلڑ کر جھولے پر بیٹھتے اور جب ہم تم کو پینگیں دیتے' تو لرزتی آواز میں کہتے۔

''ہولے ہولے جھونٹے دو ہم ڈراؤتے ہیں۔''

''کیوں ڈرتے ہو' ہم تو نہیں ڈرتے۔''

تم چپکے سے کہتے۔ ''تم گوس روٹی کھاتی ہو۔ ہم دال روٹی کھاتے ہیں۔''

اور جب اندر باہر کوئی بھی تم سے پوچھتا ہے کہ بھئی تم ہندو ہو یا مسلمان تو تم بہت اطمینان سے جواب دیتے کہ ''ہم تو بیگم صاحب کی ذات برادری ہیں۔ میں تو بیگم صاحب کا بیٹا ہوں۔''

اور تم بڑی اونچی ذات کے باہمن تھے۔ تمہارے باپ کی ذات اتنی اونچی تھی کہ اس کے نکھٹو ہونے کے باوجود تمہارے نانا نے جو ڈاکٹر تھے' اپنی بیٹی اس کو دے دی تھی۔

ہاں تو تم کو جب بھی وقت ملتا جھٹا جھٹ وضو کرتے تخت پر اماں کی جاء نماز بچھاتے اور کھٹا کھٹ رکوع اور سجدے کرتے۔ بدبدکر کے منہ ہی منہ میں دعا مانگ کر منہ پر ہاتھ پھیر لیا کرتے۔

کوئی ہنستا تو برا مانتے۔ اور جب بھی مہاراجن کو کوئی بھی ہندو ٹوکتا' ہر وقت مسلمانوں میں رہتا ہے اور ان کی نقلیں کرتا ہے تو وہ ہنس کر کہہ دیتی۔

''چلو ان کا ہی ہو کر جی جانے دو میرے تو دو بچے مر چکے ہیں۔''

اور پھر قصے کا کلائمکس یہ تھا کہ جب گھر گھر میلاد ہو رہے تھے تو ہمارے گھر بھی میلاد ہوا اور پھر تم کب ماننے والے تھے' تم مہاراجن سے لڑے اور جھگڑے اور وہ اتنی بھولی بھالی تھی کہ وہ تیار ہو گئی۔ اس نے ہم سے مانگ کر دری چاندنی کا فرش کیا۔ گل دستے منگائے' اگر کی بتیاں سلگائیں اور پٹھانی بوا کی خوشامدیں کیں کہ ہمارا للا ضد کر رہا ہے چل کر میلاد پڑھ دیو۔

اور میر محفل تم ہی تھے۔ کبھی پان بانٹتے' کبھی سب کے عطر لگاتے اور گھڑی گھڑی گلاب پاش سے گلاب چھڑکتے اور تم اس فکر میں مرے جا رہے تھے کہ کوئی ایسی بات تو نہیں رہ گئی جو بیگم صاحب کے یہاں ہوتی ہے۔

جاڑے کی راتوں میں سر شام سے سب لحافوں میں دبک جاتے اور کبھی کبھی کہانیاں سنتے تو تم بھی کسی نہ کسی کے لحاف میں گھس کر بیٹھ جاتے۔

اور بس پھر یہ ہوا کہ ایسا معلوم ہوا کہ زمین اپنے بوجھ سے گھبرا گئی ہے۔ اس کو جانے پہچانے چہرے اور آوازیں بری لگنے لگی ہیں۔ جیسے کسی نے اناج کے دانوں کو سوپ میں رکھ کر پھٹک دیا۔ کوئی اڑ کر یہاں گیا اور کوئی کہیں اور۔ بیج اور دانے جس طرف جاتے ہیں اپنی دنیا بسا لیتے ہیں۔ دھرتی کے وجود میں اپنی باریک باریک جڑیں کن کھجورے کی طرح گڑو دیتے ہیں۔ اس سے چمٹ جاتے ہیں اور اس کا سینہ چیر کر باہر نکل آتے ہیں۔

تو بھئی ربی دت قصہ یہ ہے کہ ہم یہاں آ گئے ہیں' تم وہاں ہو گے۔ کون جانے کتنے معتبر' کتنے ذمہ دار اور دانا بن گئے ہو گے۔ اب پھر ساون رت آئی ہے اور جہاں تم ہو خوب برکھا ہو رہی گی۔ کسان بوریوں کے گھونگے اوڑھے کھیتوں کی نلائی اور دیکھ بھال میں مصروف ہوں گے' بگلے اور طوطوں کی ڈاریں ادھر سے ادھر اڑتی پھرتی ہوں گی۔ برہمنیاں اپنے بھائیوں کے لیے سلونوں میں راکھیاں لے کر نکلیں گی۔ لال سبز دھوتیاں باندھے ماتھے پر بندیا اور پیروں میں آلتا لگائے ان کی بھر بھری گوری کلائیوں میں ساون کی کالی اور سبز چوڑیاں ہوں گی۔

تمہارے ہاتھ راکھیوں سے بھر بھر جاتے ہوں گے اور تم تھالوں میں سجا سجا کر دکھشنا دیتے ہو گے' دروازوں کی اوٹ سے نہیں' سامنے بیٹھ کر۔

اونہہ خیر بھئی ہم کو کیا۔ ہم کو کب شوق تھا' یہ تمہاری زبردستی تھی کہ لڑ لڑ کر راکھی بندھواتے تھے۔ اور بھئی اب ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا زمانہ بھی تو ختم ہو گیا۔ اب انسان بڑی بڑی باتوں کے متعلق سوچتا ہے۔ اب اس کو ہر چھوٹی اور گھٹیا بات سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ اور بھئی بات تو یہ ہے کہ میں یا تم جو بھی بیتے ہوئے دنوں کے متعلق سوچتا ہے غلط کرتا ہے' زندگی جہاں ہے وہاں کیوں ٹھہری رہے'

زندگی کی ناؤ کا کام وقت کی بے چین لہروں پر ڈولنا ہے اور جو وہ ساحل میں دھنس کر رہ جاتے تو۔

زندگی کے سمندر میں ایک جہاز یورپ کو جاتا ہے اور دوسرا پچھم کی اور بڑھتا ہے۔ موافق ہوائیں ان کی رہنمائی کرتی ہیں اور تقدیر ان کی منزلیں متعین کرتی ہے۔

ہماری زندگیوں کے جہان بھی اپنی اپنی سمت کو ہو لیے۔ پھر بھی آج ایک دم یہ جی چاہ رہا ہے کہ چپکے سے وہاں پہنچوں جہاں تم بڑے معتبر بنے بیٹھے ہو۔ پیچھے سے ایک ٹیپ لگاؤں اور پوچھوں راکھی بندھوانا ہے؟ اور ہماری دچھنا کا تھال کون سا وہ ہے۔

اور آج یہ سب بھولی بسری باتیں یوں کیوں یاد آ رہی ہیں' جیسے پرانا درد چمک اٹھے۔ اس لیے کہ بڑی تپش اور جلا کن کے بعد ٹھنڈی ہوا چلی ہے۔

ارے کہیں یہ پروائی تو نہیں ہے؟

◆◆◆

آنے والی ہے

صبح کیا آتی پھکو کے لیے ایک ماتم کدہ لے کر آتی۔ رات بھر تو وہی بھیانک خواب اسے دم نہ لینے دیتا' جس میں وہ ہر روز یہی دیکھتا اسے بڑا سخت پیشاب لگا ہوا ہے اور جیسے ہی وہ نالی پر بیٹھا ہے' ایک دم اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

بہت ہی واہیات تھا یہ خواب جو کئی سالوں سے اس کی جان سے چپک کر رہ گیا تھا۔ ہر رات وہی حرکت اور ہر صبح وہی ذلت اور خواری۔ سارے بہن بھائی اس کے سویرے سویرے لپٹے ہوئے بستر اور اوندھے سیدھے کپڑوں کو دیکھتے ہی ایک دوسرے کو خوش خبریاں دینے لگتے۔

''پھکو کا معاملہ پھر خطا ہو گیا۔''

''ارے پھکو کچھ تو شرم کر۔'' آپا کہتیں۔

بھائی جان خطاب دیتے ''شاہنشاہ پیشاب۔''

اور امی تو اب پھکو کے معاملے میں بالکل مایوس ہو گئی تھیں۔ کالے تلوں کے لڈو کھلا کھلا کر تھک گئیں تو انہوں نے انارکلی کے نکڑ پر بیٹھنے والے بڈھے سے ایک تعویذ خریدا اور اسی سے چاندی کے تعویذ میں ٹھکرا کر پھکو کے گلے میں ڈال دیا اور جب اس سے بھی کوئی افاقہ نہ ہوا تو انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ یہ پھکو تو جس صبح بی اے کی ڈگری لینے جائے گا اس رات کو بھی بستر ہی میں پیشاب کرے گا انہوں نے اس کو بستر بھگونے پر مارنا ڈانٹنا قطعی چھوڑ دیا اور اب تو وہ اس بات کا بھی نوٹس نہ لیتی تھیں کہ وہ بغیر نہائے دھوئے ہی اجلے کپڑے پہن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

''میں کیا کروں یہ ہے ہی اگھوری اور دلدر۔'' بھائی بہن تو خیر' نوکر تک پھکو کا مذاق اڑاتے۔ اور ضبط کی بھی حد ہوتی ہے۔ پھکو دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا اور پھر اسی رونے پیٹنے کے ساتھ ساتھ ناشتہ اور اسکول جانے کی تیاری۔

اور یہ اسکول جانے کی تیاری ہی تو قیامت تھی' اب آپ یہ جانیے کہ آدمی کو کپڑے پہنتے کیا دیر لگتی ہے۔ کسی بھی کونے سے مچڑی ہوئی ملی ولی سی خالی نیکر گھسیٹی اور اس پر بٹن ٹوٹی اجلی قمیص ڈٹ لی' نیکر کا یہ ہے کہ بٹن ہوئے تو اوندھے سیدھے لگا لیے ورنہ کھلا ہی چھوڑ دیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر احتیاط سے کنگھی جو راسی مانگ نکالی' چیڑ چیڑ کر بال بنائے اور صاحب زادے تیار کھڑے ہیں' مگر

بات تو ساری کتابیں بٹورنے کی ہوتی تھی۔۔۔۔۔۔۔کم بخت کتابوں کو بھی ساری ضد پھکو ہی سے تھی۔حساب کی کتاب تختوں کے چوکے تلے سے ملتی تو ہسٹری امرودو کے درخت کی ٹہنیوں پر ٹنگی ہوتی۔پنسل کو طوطا کتر کتر کر ناس مار دیتا۔اور قلم کی نوک پتا نہیں کس طرح ٹوٹ گئی ہوتی اور جناب رنگ کی پنسلیں اور جغرافیہ کی کتاب پتا نہیں کیوں کر باورچی خانے سے ملتی۔اللہ توبہ ہے پھکو کی تو زندگی خراب کر رکھی تھی ان کتابوں نے۔ہر ہر کتاب کا مرثیہ پڑھ پڑھ کر اور زار و قطار رو رو کر ڈھونڈتا تھا۔پھکو کے پیٹ میں پیشاب کا خزانہ تھا اور آنکھوں میں آنسوؤں کا ذخیرہ جو ہر روز بہ بہ کر بھی ختم نہ ہوتا۔

اور یوں روتے دھوتے سب سے آخر میں اور سب سے لیٹ پھکو یعنی افتخار گھر سے نکلتے۔

اسکول کے حالات بھی کچھ ایسے خوش گوار اور قابل بیان نہ ہوتے۔اپنی جانب سے تو وہ مر مر کر ہوم ورک کرتا تھا' مگر استادوں کا یہی کہنا تھا کہ آدھا تہائی بھی ہوم ورک نہیں کیا۔استادوں کو بھی اسی سے بیر پڑ گیا تھا۔کیا کرتا وہ بھی اس کی تو آنے والی ہے

قسمت ہی خراب تھی۔

اب کچھ دن سے پھکو کو ایک اور ہی لت پڑ گئی تھی آدھی تہائی کتابیں سمیٹ کر اور آنسو پونچھ پانچھ کر امی کی جان پر سدھاول ہو جاتا۔دونی دو نہیں تو اسکول نہیں جاتا میں۔

امی لاکھ جھڑکتیں اور ٹالتیں' مگر وہ دونی لیے بغیر ٹس سے مس نہ ہوتا اور پھر اس کو پیسے یوں بھی دینے پڑتے کہ ان کی ساری قیامتوں کے باوجود پھکو بھائی جان سال کے سال تیسرا دوسرا نمبر لے کر پاس ضرور ہو جاتے۔حالاں کہ امی اس سلسلے میں بھی مشکوک ہی رہتی تھیں۔''ارے یہ نامراد ماسٹر اس سے عاجز آ کر اس کو درجہ چڑھا دیتے ہیں کہ ہماری جان پر سے تو دفع ہو۔''

بہر حال دونی پھکو کو مل ہی جاتی تھی اور اس اصرار سے دونی حاصل کرنے کا بھی ایک راز تھا اور وہ یہ کہ اسکول کے اندر موٹی بھبوسی میم صاحب کی دکان تھی۔چیونگم کے پیکٹوں' بی پی مٹھائی کی تھیلیوں کے علاوہ پانچ پانچ آنے کا کیلا ببل گم اور یو یو کی دکان تھی جس میں وہ موٹی میم صاحب (جب کو بچے مذاق میں مسز جمبو یعنی ہتھنی کہا کرتے تھے) آنے والی پنسل چار آنے میں اور تین آنے کی کاپی چھ آنے میں بیچا کرتی تھیں' لیکن پھکو ان سے کبھی کوئی چیز خریدتا ہی نہ تھا۔اس کو خرید و فروخت سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔وہ تو پتا نہیں کن خیالوں میں غرق رہتا تھا۔نیکر کی جیب میں لٹو اور اس کی لتی ٹھنسی ہوئی اور بستے میں سگرٹوں کے خالی پیکٹ گھسے ہوئے' کتابوں کے صفحوں کے بیچ میں رنگ برنگی سلور جمی ہوئی۔اگر ایک سلور (پنی) بھی ادھر سے ادھر ہو جاتی تو پھکر رو رو کر جل تھل بھر دیتا۔اور وہ بس انھی چیزوں میں مگن رہتا تھا۔

ہاں تو اسکول کے اندر تو موٹی بھبوکی دکان تھی اور اسکول کے باہر دیوار کی آخری نکڑ سے لگا ہوا سہما سہما یا اور ڈری ڈری نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا تھرماسوں کی آئس کریم والا کھڑا رہتا تھا۔ چھوٹا سا دبلا سا مٹی سی رنگت پچکے ہوئے کلے اور کچی سی ڈاڑھی۔ اتنا بڈھا تو نہ تھا' دیکھنے میں بڈھا اور ٹوٹا مارا ہی لگتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بجھی بجھی آنکھیں۔ اونچی لنگی باندھے اور میلی سی پھٹی پرانی قمیض' دونوں ہاتھوں میں رنگ اڑے' زنگ آلود تھرموس اٹھائے چھٹی کا وقفہ ہوتے ہی ذرا ذرا دیر بعد ادھر ادھر دیکھ کر اپنی گھر گھراتی بلغمی آواز میں دھیرے دھیرے آواز لگاتا ''آنے والی ہے۔ دو آنے والی۔'' اور پھر بڑے درد سے کہتا ''کھوئے والی ہے۔'' مگر آنے والی' دو آنے والی طرف کم ہی بچوں کی توجہ جاتی تھی۔

سڑک پر راہ چلتے بھی اگر کبھی للچائی نظروں سے اس کے تھرماسوں کی طرف تکتے ہوئے اپنی اماں یا ابا سے فرمائش کرتے کہ کھوئے والی لیں گے' تو وہ ناک سکوڑ کر کہہ دیتے بھیا یہ آئس کریم گندی ہے۔ کھا کر بیمار ہو جاتے ہیں اور وہ یوں گھنٹوں کھڑا سوکھا کرتا۔

آئس کریم بھی شاید اس کی بک ہی جاتی۔

اور پھکو کا معمول تھا کہ انٹرویل میں اسکول کی دیوار کا گھوڑا بنا کر ضرور بیٹھا کرتا۔ اس میں یہ آرام تھا کہ ادھر کا بھی تماشہ دیکھا کرتا اور ادھر کا بھی' اور یوں رفتہ رفتہ اس کی دوستی چندا سے ہو گئی۔

ہاں اس کا نام چندا ہی تو تھا۔ چندا سے اس کا نام پوچھنے پر پھکو دل ہی دل میں خوب ہنسا تھا ایسے ہی ہوا کرتے ہوں گے' چندا ماموں' پھر وہ زور سے کہتا'

چندا ماموں آرے آئے بارے آئے۔

ندیا کنارے آئے

ساتھ دودھ ملیدہ لیتے آئے۔

آپ کھائیں تھالی میں' ہم کو دیں پیالی میں۔

اور تم چندا ماموں کیسے ہو جو آئس کریم لاتے ہو۔ چندا کچی سی ڈاڑھی ہلا کر کہتا ''ہاں بھئی اب چندا ماموں نے ملیدہ بنانا چھوڑ دیا ہے۔''

''ارے بھئی چندا ماموں؟'' پھکو ببل گم چباتے چباتے ایک بڑا سا بلبلا منہ سے باہر نکالتا۔

''ہاں کیا ہے؟'' چندا اپنے ٹوٹے ہوئے کینوس کے جوتے میں پڑی ہوئی تسلی کو کس پر باندھتے ہوئے جواب دیتا۔

''تم اپنے جوتے بدل دو اب تو یہ بالکل ٹوٹ گئے۔''

''ہاں سوچتا تو میں بھی ہوں! اب چلا نہیں جاتا ان سے۔ چلتے میں تلے پھٹ پھٹ کرتے ہیں اور بار بار ٹھوکریں لگتی ہیں۔''

''پیسے خرچ کرو تو کاہے کو ٹھوکر لگے۔'' پھکو نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''پیسا کہاں سے آئے۔ اتی مشکل سے تو آئس کریم بکے ہے۔''

''اچھا چندا ماموں ایک بات بتاؤ ایسا جوتا کتنے کو آئے گا۔''

''یہ جوتا کوئی آسان ملا جاتا ہے۔ دو روپے اور پندرہ آنے سے کم کیا لگیں گے۔''

اگر میں تم سے چوبیس دنوں تک تمہاری دو آنے والی آئس کریم روز لوں' تو جوتا بھی آ جائے گا اور اکنی گھاتے میں بچے گی۔'' پھکو حساب میں شروع سے تیز تھا۔ اس نے دو گھڑی سوچنے کے بعد چندا کو اس حقیقت سے مطلع کر دیا تھا۔

چندا نے کافی دیر حساب لگایا کچھ انگلیوں پر جوڑا اور بولا: ''واہ بھئی افتخار حسین تم تو بڑے ماشٹر نکلے' میں تو سمجھتا تھا تم صرف لٹو صرف لٹو ہی گھمانا جانو ہو۔''

''اچھا پھر ہو جائے۔۔۔۔۔۔ کل سے میں تمہاری دو آنے والی روز خریدا کروں گا۔'' اور دوسرے ہی دن سے پھکو نے امی کی جان ضیق میں کرنا شروع کر دی تھی اور دونی لیے بغیر ٹلتا ہی نہ تھا۔ لیکن چوبیس دن گزر جانے کے بعد پچیسویں صبح کو بھی پھکو نے چندا کو انہی بھوسلے اور ٹوٹے ہوئے کینوس کے جوتوں میں دیکھا تو اس کا جی جل کر خاک ہو گیا۔

بس معلوم ہو گئی ساری حقیقت' یہ ہے ہی اگھوری دلدر۔ اس نے دل میں امی کے وہ لفظ دہرائے جو وہ خاص الخاص اسی کی ذات کے لیے استعمال کیا کرتی تھیں۔ اونہہ یہ سب اس کے نام ہی کا اثر ہے۔ ابھی کل ہی تو ابو جی نے اس کو ''ٹائمز'' میں چاند کی شکل دکھائی تھی کہ لو بھئی پھکو جی یہ رہے تمہارے ''چندا ماموں۔'' بھیانک سی شکل سارے منہ پر گومڑے سے اٹھتے ہوئے دیکھ کر دل متلا گیا۔ اب یقین تو کرنا ہی پڑا نا۔ سارے روس اور امریکا والے کہتے ہیں کہ ان کے راکٹ نے خود اپنی آنکھوں سے چندا ماموں کی گھناؤنی شکل دیکھی ہے۔

اونہہ یہ کم بخت کیا گڑبڑ مچاتے ہیں۔ پھکو کو اس گھڑی ایسا معلوم ہوا کہ اس کے سارے شیشے کے محل چھن چھن کر کے ٹوٹ گئے۔

چاند کے غاروں کی پریاں ساری مر کر خاک میں مل گئیں اور چاند کے اندر کی بڑھیا اپنا چرخہ اور کاتے ہوئے چاندی کے تار لیے جنگلوں ویرانوں میں پھٹکتی پھر رہی ہے۔ نگوڑی ہزاروں برس بوڑھی بڑھیا۔ بھلا اس کو ویران کر کے کیا مل گیا ان کو ہاں تو بس چندا بھی عین مین ویسا ہی گوڈر ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ اس سے قطعی ناراض ہو کر منہ پھیر لے' مگر اس کی کچی ڈاڑھی اور چپڑائی ہوئی آنکھوں میں نہ جانے کیا کشش تھی کہ وہ سرکتا سرکتا دیوار کے اسی کونے پر جا ٹکا جدھر وہ کھڑا تھا۔ کندھے جھکائے زنگ آلود تھرماس اٹھائے۔

''کبھی اندر بھی آ جایا کرو۔'' پھکو نے دیوار کے گھوڑے پر اپنی نشست جماتے ہوئے کہا۔

''توبہ کرو کیا اپنے ماشٹروں سے جوتے کھلواؤ گے! ہم کو تو یہاں سے بھی دھکے دے دے کر ہٹایا جاوے ہے۔''

پھکو نے بات بدل دی۔ ''اور وہ جوتے نہیں لیے۔ کھا گئے نا سارے پیسے۔''

چندا خوش دلی سے ہنس دیا۔ ''ارے کھا کہاں گیا۔ بڑے لونڈے کے پیر میں جوتا ڈالوا دیا۔'' اس کی آنکھوں میں ایک مدھم سی کرن جاگی۔ ''میرا بڑا لونڈا بھی تو تمہاری طرح اسکول جاوے ہے۔ ننگے پیر جاوے تھا۔''

''تمہارا لڑکا کہاں پڑھتا ہے؟''

''میرا لڑکا۔'' چندا رکا اور پھر بولا۔۔۔۔۔۔۔ ''وہ گرجے کے پیچھے والے اسکول میں۔''

''کہاں! کہاں بھنگیوں کے اسکول میں' ہیں!'' پھکو نے مذاق اڑایا۔

''تو اور کیا تمہارے اسکول میں۔'' چندا جز بز سا ہو گیا۔

''اچھا پھر اب تمہارا جوتا کیسے آئے گا۔''

''لے لوں گا کبھی۔'' چندا بڑی قناعت اور بے نیازی سے بولا۔

اس کم بخت کو ذرا افسوس نہیں کہ ٹوٹے ہوئے جوتے پہنے پھرتا ہے' یہ ہے ہی اگھوری۔ پھکو نے ایک بار پھر طے کر لیا۔ اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا ''اچھا اب اس دفعہ سے پھر جمع کر لینا۔'' پھر وہی چکر شروع ہو گیا۔ ہر روز دونی چندا کی جیب میں پہنچ جاتی اور زنگ آلود تھرماس میں نکلی ہوئی ملگجی رنگت کی آئس کریم پھکو کے پیٹ میں۔ کوئی بھی بیمار نہیں پڑتے۔ پھکو ہر بار آئس کریم ختم کر کے سوچتا۔

اس صبح پھکو بہت ملول اور افسردہ تھا۔ وہ عادتاً چھٹی کے وقفے میں دیوار کا گھوڑا بنا کر بیٹھا تو' مگر بالکل چپ چپ تھا اس نے بغیر بات کیے دونی چندا کو دی اور میلی کچیلی آئس کریم چوسنے لگا۔

''افتخار حسین پھکو آج کیا بات ہے۔ کاہے کو ٹی گم ہے۔'' چندا نے چھیڑا۔

پھکو بات کرنے کے بجائے آج خودکشی کرنے کے موڈ میں تھا۔ بات فقط اتنی تھی کہ ڈھاکے سے چچا میاں آئے تھے اور ان کی بیٹی نینو بھی۔ جس پر وہ ہمیشہ ہی رعب ڈالا کرتا۔ جناب میں جلتے چراغ کو لو میں سے رومال نکال لیتا ہوں۔

سونے کی انگوٹھی ہوا میں ایسی اچھالتا ہوں کہ ساری زندگی نہیں ملتی وغیرہ وغیرہ۔

اور پھٹی پھٹی آنکھوں والی نینو سب بات کا یقین کر لیا کرتی تھی۔ اب کی جو وہ آئی تو ذرا عقل مند اور بڑی ہو کر اور ساری شام وہ اس پر رعب گانٹھتا رہا اور وہ ہر بات کا یقین کرتی رہی' لیکن رات کو وہی دشمن جان خواب جو چم چچڑ ہو کر اس کی جان کو لپٹ گیا تھا' پھر نظر آیا اور صبح وہ بھی تر بتر تھا۔ بس پھر کیا تھا سارا گھر حسب معمول مع چچا میاں' چچی بی اور ان کے سب بچوں کے اس کی ہنسی اڑانے پر تل گیا اور نینو نے ناشتے پر ناک سکوڑ کر کہا' پھکو صاحب بڑے بازی گر بنتے ہیں' اپنا پیشاب تک کنٹرول نہیں کر پاتے۔ ہماری تو منی بہن بھی بستر نہیں بھگوتی۔

پھکو کے ہاتھ سے پیالی لڑھک گئی۔ ساری میز پر دودھ کا دریا بہ گیا۔ نینو کے سامنے اس کی دوسری انسلٹ یہ ہوئی کہ دیے آپا جان نے گدی پر کس کس کے دو ہاتھ۔ پھکو بلا ناشتہ کیے اور بغیر کتابوں کا ماتم کیے چپکے سے آدھا تہائی بستہ اٹھا کر امی سے دونی مانگ کر سرک آیا۔ آج امی نے بھی دونی دینے میں ردوکد نہ کی تھی۔ ان کو معلوم تھا کہ بھوکا اسکول جا رہا ہے پر یہ نہ معلوم تھا کہ وہ لے کر کیا کھاتا ہے۔

چندا کے بار بار چھیڑنے پر پھکو کا جی چھوٹ گیا اور وہ سسک سسک کر رونے لگا۔

''ارے ارے پھکو بیٹے کیا ماسٹر جی نے بہت مارا ہے کچھ تو بتاؤ'' چندا کی ہمدرد آواز نے پھکو کے دل میں اس کے لیے بڑا اعتماد پیدا کر دیا۔ وہ اس کے اور بھی قریب کھسک کر بیٹھ گیا اور بڑی سرگوشی میں اپنے اس خواب کا حال اس کو بتانے لگا۔ اس عقیدت سے جیسے چندا کوئی بڑا سیانا پیر ہو۔

ساری بات سنا کر پھکو نے کہا:

''کیا کروں' میں تنگ آ گیا میرا تو دل چاہتا ہے مر جاؤں اپنا گلا کاٹ کر۔''

''ارے ارے پھکو میاں یہ حرکت نہ کرنا۔ لوگ کیا کہیں گے کہ افتخار حسین پھکو کا اتنا ننھا سا مردہ اٹھا۔ پورے بڑے بڈھے ہو کر ٹھاٹ سے مرنا۔'' چندا نے لرز کر کہا۔

''تو پھر کیا کروں۔'' پھکو بے بسی سے بولا۔

''ارے یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں نے خود چودہ برس کی عمر تک پڑے پڑے موتا ہے۔ پر میں تو ایک ٹوٹکے سے ٹھیک ہوا۔ تم کا ہے کو کرنے لگے۔'' چندا نے خلا میں تاکتے ہوئے مایوسی سے کہا۔

''نہیں تم بتاؤ تو سہی۔''

''کوئی دھوبی ہے آس پاس تمہارے؟''

''ہاں ہمارے کواٹروں میں رہتا ہے۔''

''بس پھر کیا ہے سونے سے پہلے جا کر پکارو۔ دھوبی! ارے دھوبی! جب وہ جواب دے تو یہ کہہ کر بھاگ آؤ تو پڑے پڑے موت میں کھڑے کھڑے موتوں۔ اور بس سرپٹ دوڑ آؤ' مگر ایک بات بتائے دیتا ہوں۔ اثر ہوگا پر دیر میں' بس جب بھی رات کو یہ خواب آنا بند ہو جائے جب ہی سمجھو اثر ہو گیا۔ دھاڑ نہ مچا دینا۔''

''اچھا بھئی'' پھکو نے مردہ آواز میں پوچھا ''کے روز کروں؟''

''بس تین دن کر کے چھوڑ دو۔ آپ بند ہو جائے گا سالا پیشاب۔'' نیچے سے پھکو کے ساتھیوں نے اس کو لٹو کے میچ کے لیے پکارا اور وہ ہشاش بشاش' دیوار کود کر نیچے آ گیا۔

لو بھئی پھکو نے ٹوٹکا تو کر لیا۔ بس اب پیشاب بند ہونے کے انتظار میں تھا۔

ایک دن پھکو چندا کو دیکھ کر بڑے پراسرار طور پر ہنسا۔

''کیا بات ہے؟'' چندا نے پوچھا۔

''تمہاری ایک بات معلوم ہوئی ہے!'' وہ اور بھی پراسرار طریقے سے مسکرایا۔

''کیا؟'' چندا نے حیرانی اور شوق سے پوچھا۔

''اوں۔۔۔۔۔۔'' پھکو اٹھلایا۔ ''کل ہم نے دیکھا تم لال لنگی باندھے' بنیان پہنے اور کمر پر مشک اٹھائے سڑک پر پانی چھڑک رہے تھے۔''

''تو کیا ہوا میں سقا ہی تو ہوں ذات کا۔''

''اچھا پھر تم آئس کریم کیوں بیچتے ہو؟''

''ارے ہمارا کیا ہم مہاز رلوگ ٹھہرے جو جی میں آیا کرنے لگے۔''

''تم ابھی تک مہاز رہو!'' پھکو نے حیرت سے پوچھا۔

''اور کیا' ہم تو پیدائشی مہاز رہیں۔'' چندا نے اس فخر سے کہا کہ پھکو کا دل تڑپ اٹھا کاش! وہ بھی پیدائشی مہاز رہوتا تو جو جی میں آتا کرنے لگتا۔ رشک کی ایک چنگاری سی اس کے سینے میں سلگی۔

''چندا ماموں پھر تو تم اب خوب پیسے کمارہے ہوگے۔ خوب پیسے جوڑو گے۔''

''ہاں پھکو میاں اب مجھے اپنی بیٹی کی شادی جو کرنا ہے۔''

''تمہارے لڑکی بھی ہے؟''

''میں سات بیٹیوں کا باپ ہوں۔'' چندا کی گردن فخر سے اکڑ گئی' اور ایک لڑکا ہے۔ وہ جب پڑھ لکھ کر کمائے گا' تو میں چین سے اجلے بستر والی کھاٹ پر بیٹھ کر بابو لوگوں کے ابا کی طرح حقہ پیا کروں گا۔''

''ہاں چندا سچ!''

''ہاں پھکو میاں سچ۔''

اور یہ ہفتے کا دن تھا۔

اتوار کی صبح کو سب بچے ریڈیو کے گرد بچوں کا پروگرام سن رہے تھے کہ بچوں کی خبریں ہونے لگیں اور ایک خبر یہ بھی سنائی گئی کہ تھرماسوں کی آئس کریم والوں کے ذخیرے میں سے چھپکلیاں' مکھیاں اور چوہیاں نکلیں اور پھکو کا دل الٹ پلٹ ہوگیا۔ جیسے اس کے پیٹ میں بے شمار مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں' چھپکلیوں کی دمیں تڑپ رہی ہوں اور بے شمار چوہیوں کی آنتیں اس کی آنتوں سے چمٹی جارہی ہوں' اور اوپر سے خبریں سنانے والے صاحب نے بچوں کا دل تھرماسوں کی آئس کریم سے خوب برا کیا اور یہ پٹی پڑھائی کہ ہرگز ہرگز وہ آئس کریم نہ کھائیں۔

آخ تھو' یہ ریڈیو والے کتنے گندے ہوتے ہیں' کیسی گھناؤنی باتیں کرتے ہیں نینو نے اس کی طرف دیکھ کر زمین پر تھوکا۔

اور پھکو کو یوں لگا جیسے کہتی ہو کہ اور تم اس سے بھی زیادہ گندے ہو' تمہارے پیٹ میں تو چھپکلیوں والی آئس کریم ہے۔

چندا اور اس کی آئس کریم کے خلاف نفرت کی ایک لہر اس کے دل میں اٹھی اور فوراً چندا کی ٹمٹماتی ہوئی آنکھیں اور کچی ڈاڑھی اس کے سامنے آگئی۔ اس نے غصہ تھوک دیا۔ اور نینو نے یہ سمجھا کہ پھکو نے گھن کے مارے تھوکا ہے۔

شکر ہے گھر میں کسی کو خبر نہ تھی کہ پھکو تھرماسوں کی آئس کریم کھاتا ہے۔

اور اب یوں ہوتا کہ پھکو دیوار پر تو بیٹھتا' پر وہ چندا کی آئس کریم نہ کھاتا' اور جب چندا صدا لگاتا۔ آنے والی ہے دو آنے والی ہے کھوئے والی ہے' تو پھکو ساتھ میں اضافہ کرتا' مکھی والی ہے' چوہی والی ہے۔ اور چندا اتنا صاف قلب کہ ساتھ میں ٹھٹھا لگا کر خود بھی دھیرے سے کہتا کہ مکھی والی ہے' چوہی والی ہے۔ چندا کی اسی صاف قلبی سے اس کی اور پھکو کی دوستی قائم رہی۔ چندا نے پھر اس کو کبھی مجبور نہیں کیا بلکہ اس سے کبھی فرمائش نہیں کی کہ وہ اس سے آئس کریم لے۔ وہ ناک چڑھا کر کہتا ''ریڈیو والوں کا کیا ہے۔ وہ بھی بڑے لوگ اور ہمارے مقابلے کے آئس کریم فیکٹریوں والے بھی بڑے۔ سب سازش کی باتیں۔''

ایک ہفتہ۔ پھر دو ہفتے گزر گئے۔ ایک انٹرویل میں جب پھکو آ کر دیوار پر بیٹھا تو اس کے ہاتھ میں اورنج فروٹی تھی' جو گیا جو گیا ٹھنڈی ٹھنڈی نارنگی کے مزے کی۔

''اب یہ کیوں کھا رہے ہو؟'' چندا نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ ''یہ کہاں سے لی؟''

''اب یہ کیوں کھا رہے ہو؟'' چندا نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ ''یہ کہاں سے لی؟''

''مسز جمبو کے آئس بوکس سے۔''

''اچھا۔'' چندا نے سر جھکا لیا۔ اس کے جوتوں کی حالت اور بھی خراب تھی۔

دوسرا دن تیسرا دن اور پھر چوتھا بھی گزر گیا۔ چندا اپنی جگہ پر سے غائب تھا۔ کباب والے نے بتایا چندا بیمار پڑا ہے۔ پھر اسکول میں ایک ہفتے کی چھٹی آ گئی۔

ہفتہ بھر بعد افتخار حسین پھکو اپنی جگہ پر آ کر بیٹھا' تو نیچے سے کباب والے نے آواز دی:

''پھکو صاحب' تمہارے چندا ماموں آسمان پر پہنچ لیے۔''

''کون چندا ماموں؟'' پھکو نے کچھ نہ سمجھ کر کہا۔

''ارے بھئی وہی چندا ماموں۔ آنے والی ہے' دو آنے والی ہے'' اور پھکو کو ایسا معلوم ہوا کہ فضائے بسیط کے بیچوں بیچ چندا اپنی ٹمٹماتی آنکھوں' اونچی لنگی' زنگ آلود تھرماسوں اور ٹوٹے جوتوں سمیت کھڑا آوازیں لگا رہا ہے۔

''آنے والی ہے دو آنے والی ہے' مکھی والی ہے' چوہی والی ہے۔'' افتخار حسین پھکو دیوار سے کود گیا۔

اور پھر چند دن کے بعد جب چندا کا لڑکا جو بھنگیوں والے اسکول میں پڑھتا تھا' زنگ آلود تھرماسوں کے بوجھ سے دبا ہوا اسی

کونے پر کھڑا کھیلتے ہوئے بچوں کو حسد اور رشک سے دیکھ رہا تھا' تو پھکو نے سوچا کہ ارے اسے تو پڑھ لکھ کر بابو بننا تھا اور چندا کو اجلے بستر والی کھاٹ پر بٹھا کر حقہ پلانا تھا۔ مگر خیر چندا ماموں تو اب آسمان پر پہنچ لیے تھے۔۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔۔ پھر ایک چھوٹی سی آواز دبی دبی سی رندھی ہوئی دیوار کے پاس منڈلائی۔

''آنے والی ہے۔ دو آنے والی ہے کھوئے والی ہے۔'' پھکو نے چپکے سے دھیمی سی صدا لگائی۔

''مکھی والی ہے۔ چوہی والی ہے۔''

◆◆◆

بازگشت

ساری آسمانی نائیلون کی تھی اور سفید انگورا وول کا نیم آستین بلاؤز۔ پیروں میں اسپنج کی چپلی تھی اور مانگ کے دونوں طرف بالوں میں سفیدی کی دل کش لہریں۔ ہاتھ میں اخبار تھا اور خبروں پر سرسری نظر۔

اخبار تو وہ یوں ہی عادتاً دیکھ لیتی تھی۔ اس کو کسی خبر اور کسی واقعے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

سماترا کے باغیوں نے نئی حکومت کا اعلان کر دیا تو وہ کیا کریں۔ ماؤ ماؤ کے آخری لیڈر کی گرفتاری سے ان کو کیا مطلب۔ ڈاکٹر گراہم کی جنیوا کو روانگی کس کام کی۔ اونہہ فرانسیسیوں نے ایک سو بیاسی عرب مار ڈالے تو وہ ماتم کیوں کریں۔ ہٹاؤ۔ انہوں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ دنیا میں خدا جانے کیوں گڑبڑ پھیلی رہتی ہے۔ یہ ہنگامے کیوں ہوتے رہتے ہیں۔ شکر ہے ان کی اپنی دنیا تو صحیح سلامت تھی۔ ایک نظر اپنے گرد و پیش پر ڈال کر انہوں نے سوچا۔ برآمدے کے شفاف فرش میں ان کے چہرے کا عکس صاف نظر آ رہا تھا۔ چاکلیٹی بید کے خوب صورت مونڈھوں کے درمیان نازک سی میز پر بیرون ملک سے آئے ہوئے میگزین اور رسالے پڑے تھے۔ ہیٹ ریک پر قیمتی اور نفیس ہیٹ لٹکے ہوئے تھے اور خانے میں چھڑیاں رکھی تھیں اور برساتی میں واکس ویگن کھڑی تھی اور برساتی کی سرخ پیشانی پر چنبیلی کے گچھے جھوم رہے تھے۔ لیکن اس وقت گھر کا مکمل سکون سناٹے کی صورت اختیار کیے ہوئے تھا۔ ان کا دل ہر کام سے اچاٹ تھا۔ ان کی بیٹی کالج میں تھی۔ بیٹے کے ابا دفتر میں اور چھٹی پر ولایت سے آیا ہوا لڑکا کسی پکنک میں بور ہونے گیا ہوا تھا۔ وہ یہاں ہر وقت اور ہر محفل میں بور ہوتا تھا۔

انہوں نے اخبار ایک بار پھر اٹھا لیا۔ بے دلی سے ورق پلٹتی چلی گئیں۔ چوتھے صفحے پر ایڈیٹر کے نام الٹے سیدھے خط نظر آتے ہی وہ پھر بیزار ہو گئیں۔ اور منی بس سے شکایتیں، یونی ورسٹی سے شکایتیں، تعلیم کے دکھڑے، اقبال کا فلسفہ، خدا معلوم کن بیکاروں کے لیے یہ کالم رکھا گیا ہے۔ بگڑی اور بھڑکی ہوئی نگاہ پانچویں صفحے پر ٹکی اور پھسلی اور پھر ٹیونس پر بم باری کی تصویریں دیکھنے لگی۔ اونہہ ارے یہ کون ہے؟ یہ کس لڑکی کا چہرہ ہے؟ نگاہ بھڑک بھڑک کر ٹھہری اور پھر وہیں جم گئی۔

گھنے سیاہ بالوں کے سائے میں روشن پیشانی اور گھنی بھوؤں کے سائے میں گہری گہری سیاہ آنکھیں، قدرے پھیلی ہوئی ناک اور دبیز لبوں کے درمیان ہموار دانت۔ کس کا ہے یہ دل کش اور سادہ سا چہرہ! نگاہ اوپر لپکی۔۔۔۔۔۔۔ الجیریا کی ایک

مجاہدہ۔۔۔۔۔۔۔جمیلہ۔۔۔۔۔۔۔بجلی کے کوندے کی طرح الجیریا کی خبریں ان کے ذہن میں کانپنے لگیں۔

یہ مسکراتا ہوا چہرہ فرانس کے آہنی سلاخوں کے پیچھے اپنی زندگی کے آخری دن گن رہا ہوگا! دور نیلے آسمان کے عقب میں' تاریکی کے غاروں میں موت کا دیوتا اس کو بیاہ لے جانے کی تیاریاں کر رہا ہوگا۔ اس نے تصویر کو غور سے دیکھا۔ الجزائر کی جمیلہ' کیا تمہاری ماں نے اسی دن کا ارمان کیا تھا؟ کیا اس نے تمہیں کبھی یہ تلقین نہ کی تھی کہ ''میری بچی زندگی کی ہر حقیقت کو بھول کر اور وطن کے ہر تقاضے کو ٹھکرا کر ایک پرسکون گھروندا بنالے؟''

نظر ایک بار پھر اس چہرے کی طرف گئی۔ یقیناً یہ چہرہ گہرا سانولا ہوگا۔ اس میں جوانی کے خوان کی سرخی رچی ہوگی۔ اس کے دماغ میں چھپے ہوئے وہی گہرے گہرے اور راسخ خیال ہوں گے جنہیں وہ خوب جانتی تھی۔

ہاں میں تمہیں پہچانتی ہوں' مانا کہ میں عمر میں تم سے بیس سال بڑی ہوں لیکن تم مدتوں میرے ساتھ رہ چکی ہو۔ ہاں تم وہی تو ہو' تم مجھ جیسی کتنی لڑکیوں کے ذہنوں میں رہ چکی ہو۔ ان کی سوچوں کے دروازے کھٹکھٹا چکی ہو' اور پھر مجبوریوں اور ماپ کی خواہشوں نے تمہارا گلا گھونٹ دیا ہے۔

اور اب تم نے الجزائر کی جمیلہ کے روپ میں ایک نیا جنم دھارا ہے۔ سچ بتاؤ کیا تمہیں بھی نیلے آکاش کی سندرتا کے پیچھے گہرے گہرے راز چھپے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کیا تم کو بھی کوہساروں کی برفانی چوٹیاں اشارے کرتی ہیں۔ ضرور یہی کچھ محسوس ہوتا ہوگا۔ ہاں مجھے یقین ہے کہ تم کو محسوس ہوگا کہ تمہارے پر لگ آئے ہیں اور تم بلندیوں کی طرف اڑتی چلی جارہی ہو۔ جبھی تو تمہارے چہرے کے موٹے موٹے نقوش پر اتنا پیار آرہا ہے۔ اپنی تابندہ سے بھی زیادہ۔

تابندہ کے نام پر وہ بے اختیار مسکرانے لگی۔ اس نے تابندہ کو کس طرح ایک سوچے سمجھے پروگرام کے تحت پالا تھا۔ یعنی کہ اس کے بال بے حد اونچے کٹے تھے۔ وہ بہترین شلوار' قمیصوں کے علاوہ سلیکس اور ٹوئن سٹ پہنا کرتی تھی۔ فراٹے سے انگریزی بولتی تھی: البتہ مجبوراً اردو بولنا پڑے' تو پہلے بڑی فخریہ عاجزی سے اٹک اٹک کر معذرت خواہ ہوتی تھی:

''معاف کیجیے گا مجھے اردو نہیں آتی۔''

ہر ہفتے وہ بھائی اور دوسرے کزن برادرس کے ساتھ سینما دیکھنے جاتی تھی۔ اور وہ اپنی تابندہ پر دل سے فدا تھیں۔ جبھی تو شروع ہی اس نے بیٹی کے دل میں چھوٹی چڑیا کی طرح اڑن پرواز مانگنے کی آرزو ابھرنے ہی نہ دی اور نہ ان کو بیٹی کو یہ بہلاوا دینے کی ضرورت پیش آئی کہ ابھی کچھ دن انتظار کرو۔

اور اس خلاف توقع انکشاف سے کتنی اذیت ہوتی ہے جب وہ ایک ماں اور بیوی نہ بنی تھی' بلکہ ایک ننھی سی لڑکی تھی جس کو بچپن ہی سے خلاؤں میں تکنے کی عادت تھی جو مریخ کی سیر کے پروگرام بنایا کرتی تھی اور چاند کے غاروں میں جا بسنے کے سہانے خواب دیکھا کرتی تھی۔ جس کو افق کے ابھرتے ہوئے خطوط بڑے ہی البیلے نظر آتے تھے جس کا بیٹھنے بیٹھنے توڑ مروڑ ڈالے اور پھر اسی شکستہ سامان سے کوئی بہت ہی انوکھی اور من بھاونی چیز بنا ڈالے۔ اور جب کبھی وہ الٹے سیدھے الفاظ میں اپنی آرزوؤں کا ذکر اپنی ماں سے کرتی تو وہ لرز لرز جاتیں اور چھوٹی چڑیا کی ماں کی طرح کہتیں' پہلے بڑی تو ہو لے پھر جو چاہے کرنا۔ اور وہ یہ سوچتی ہوئی مگن اور مطمئن ہو جاتی کہ پہلے بڑی تو ہو لوں' پھر ایک دن چھوٹی چڑیا کی طرح پھر سے اڑ جاؤں گی۔ یوں وہ حسرت پرواز لیے اسکول کے بڑے اجنبی ماحول میں پروان چڑھتی رہی' جہاں برف کی طرح سرد اور سفید راہبائیں سیاہ لبادوں میں لپٹی ہوئی بڑی کوششوں سے اس کے تمدن اور ماحول سے دور' بہت دور لیے جا رہی تھیں۔ بعض وقت تو وہ یہ بھی بھول جاتی کہ دراصل اس کی ابتدا کیا ہے اور انتہا کیا ہے۔ اسی طرح ایک بے نشان منزل کی راہوں پر چلتی ہوئی وہ کالج میں جا پہنچی۔ کالج کی زندگی نے سیاہ لبادوں میں ملفوف برفانی مجسموں کی بتائی ہوئی قدروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا کوئی اس کو جھٹلا رہا ہے جیسے ہر بات کا پول کھلا جا رہا ہے۔ جیسے بدیسی خیالوں اور نظریوں کے بنائے ہوئے وہ سارے نگاریں قصر سرنگوں ہوئے جا رہے ہیں۔ کوئی پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ دیکھو تم جس راہ چلی ہو' وہ تو انگلستان کو جاتی ہے۔ تمہاری راہ تو وہ ہے جدھر یہ بھوکوں' ننگوں' بیماروں اور بے غیرتوں کا قافلہ رواں ہے۔ وہ کالج کی سرد سیڑھیوں پر بیٹھ کر آپس میں باتیں کرتیں۔ ان کے ساز حیات کا ہر ہر تار ایک جھنا کے کے ساتھ بج اٹھتا اور نہ جانے کیا کرنے کو جی چاہنے لگتا۔۔۔۔۔۔

وہ بیٹھی بیٹھی جھنجلا جاتی۔ لعنت ایسی تعلیم اور ایسے شعور پر۔ آخر یہ سب کس کام آئے گا۔ ارے بھائی ہمیں کچھ کرنے دو نا۔ اس کی ماں کے تیور یہ سن کر بدل جاتے۔ وہ بڑے تدبر سے سر ہلاتیں۔ وہ اس عورت کی زندگی کی معراج بتاتیں اور الٹے سیدھے کام کرنے والی سر ہلاتیں۔ وہ اس عورت کی زندگی کی معراج بتاتیں اور الٹے سیدھے کام کرنے والی سر پھری عورتوں کو سرے سے عورتوں کی صف ہی سے خارج کر دیتیں۔

اور جب ایک دن اس کے کالج میں عجیب وضع کے چند لوگ آئے۔ اجڑے ہوئے بالوں اور معمولی کپڑوں میں' مگر ان کی تقریروں میں خلوص تھا' اور ان کے چہروں پر سچائی اور عزم کی دمک' ان کی باتوں نے اس کے دل میں گویا گھر ہی کر لیا۔ اس کے دماغ کی رگ رگ میں چبھتا تھی اور دل کی ہر دھڑکن میں بڑا ہی صادق جذبہ تھا۔ وہ اسی دلچسپ اور انوکھے بخار میں جھلستی ہوئی گھر پہنچی۔ ماں

نے اس کی ہزیانی گفتگو کو بڑے غور سے سنا اور بڑے تدبر سے اس کو ٹھنڈا کیا۔ بڑے موثر قصوں اور عبرت ناک مثالوں کے بعد پھر بہلاوا دیا۔ آنے والے وقت کا انتظار کرو۔ ابھی بال و پر نکلنے تک آرام کرو۔

اور وہ اس بات پر راضی کر لی گئی کہ ہم جس سے کہیں اس سے ملو اور جہاں کہیں وہاں جاؤ اور پھر جب سہرے کی گھڑی آئے تو پھر اچھی بیٹیوں کی طرح ساری رسم و رسوم اور باجے کے ساتھ اپنے گھر یوں سدھارو کہ ایک دنیا دیکھے اور حسد کی آگ میں جل جائے۔

بٹیا بڑھتی گئی۔ اس کی بے دست و پائی پروان چڑھتی رہی اور پھر وہ ایک دن اپنے گھر سدھاری۔ گھر والا اسمارٹ تھا اور خوش لباس۔ اس کی آمدنی کے معلوم اور نامعلوم ذریعوں نے بڑی فردوسی زندگی پیش کی جس کے آگے اس نے ہتھیار ڈال دیے اور وہ روح اور وہ ہستی جو آج اس جمیلہ کا روپ دھارے بیٹھی رہتی' بغیر کفن دفن کے ابدی تاریکیوں میں جا سوئی تھی۔

مگر چھوٹی لڑکی کی کہانی ادھوری رہی جاتی ہے۔ پھر کیا ہوا کہ ایک نئی گھر والی نے جنم لیا اس کے گھر کا کونہ کونہ چمکتا تھا۔ اس کا حسن انتظام مثالی تھا۔ لیکن یہ اس کی سمجھ میں کبھی نہ آ سکا کہ وہ اپنی بیٹی کو کس ڈھب پر اٹھائے۔ یہ تو طے تھا کہ چھوٹی چڑیا یا چھوٹی لڑکی کے تقاضے سراسر غلط تھے اسی شش و پنج میں سولہ سال گزر گئے وہ تابندہ کو کشاں کشاں گھسیٹتی تھوڑی دور ہر راہ رو کے ساتھ چلتی۔ عبیدہ آپا کی بیٹی سات سال ولایت میں رہ کر آئی ہے بس تابندہ کو اسی کی تقلید کرنا چاہیے۔ چٹ اس کی بھلی چنگی چوٹی کٹوا پھینکی۔ غرارے تہ کر کے رکھ دیے گئے۔ اور وہ گردن بڑھا بڑھا کر بڑے فخر سے کہتی۔ ہماری صاحب زادی اردو میں فیل ہو گئیں۔ سنا آپ نے۔

اب انہوں نے تابندہ کو بڑی سنجیدگی سے تلقین شروع کی۔ دیکھو تابندہ لڑکوں سے ملو اور ان میں سے کسی کو چن لو۔ دوسرا ہر خیال باطل ہے۔ تم تو بس اسٹائل پیدا کرو اسٹائل۔

اور تابندہ نے دل سے ہر خیال نکال دیا۔ کالج ہو یا گھر اس کے چہرے پر ویٹنگ روم کے مسافروں کی سی کیفیت نظر آنے لگی۔

مگر آج اس جمیلہ کی تصویر نے اور اس مسکراتے ہوئے چہرے نے اس کا سارا پروگرام خراب کر دیا تھا۔ آج ذہن میں برسوں پرانے خیالوں کی بازگشت گونج رہی تھی۔ اور وہ عجیب عجیب باتیں سوچ رہی تھیں۔ اب تابندہ بھی اپنی نئی نسلوں کو یہی تلقین کرے گی اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جانی پہچانی شخصیت اب یہاں کبھی نہ ابھرے گی۔ یہاں الجزائر کی جمیلہ کے بدلے تابندائیں پیدا ہوا کریں گی' مگر جمیلہ کا گلا تو خود اس نے مدت ہوئی اپنے ہاتھوں گھونٹ دیا تھا۔ فرط غم سے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''امی میں کھانے کے بعد میٹنی میں جا رہی ہوں۔'' تابندہ کی آواز کہیں دور سے گونجی اور اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ تابندہ اپنی سہیلی کے ساتھ سامنے کھڑی تھی۔

''کوئی ضرورت نہیں۔''اس نے غصے سے کہا۔

''ضرورت کیوں نہیں' ہمارا صبح سے پروگرام ہے۔''

''بس ایک یہی پروگرام رہ گیا ہے۔زندگی کا مقصد سینما اور تفریح کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں۔لعنت ہے ایسی بے مقصد زندگی پر۔''

تابندہ حیران ہوگئی۔امی کو بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہوگیا ہے۔

''مگر کچھ ہو' میں جارہی ہوں۔آپ کو ہمارا پروگرام گڑبڑ کرنے کا حق نہیں ہے۔''

''ہاں بے شک مجھے کوئی حق نہیں۔غلطی میری ہے۔''وہ زاروقطار رو رہی تھی۔

''اونہہ امی پر ایسے ہی موڈی دورے پڑا کرتے ہیں۔''اور وہ کھٹ کھٹ کرتی چلی گئی۔

آنسوؤں کا تار جمیلہ کے کاغذی چہرے کو بھگو رہا تھا۔

◆◆◆

شہپر

''مجھے تمہاری تمنا ہے' مجھے تمہاری ضرورت ہے اور شاید مجھے تم سے محبت ہے!''

جہاں آرا سید نے دوران پرواز میں اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اپنی گلابی ڈوروں والی جھکی جھکی آنکھوں سے دیکھ کر سوچا اور پھر دل میں دہرایا:

''اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔''

اور وہ جو اس کے خیالوں سے قطعی بے خبر تھا' اس وقت ہر روز سے زیادہ پرسکون اور خوب صورت نظر آ رہا تھا اس لیے کہ ایک بڑی ہی ناممکن بات ممکن ہو گئی تھی۔ یعنی بید کے سے نازک اور لچک دار قد اور کشادہ پیشانی کے نیچے گھنیری پلکوں کے سائے میں جھکی جھکی آنکھوں والی ایئر ہوسٹس جہاں آرا آج اس کی ملکیت تھی اور اس کی منکوحہ کی حیثیت سے اس کے بالکل قریب بیٹھی تھی۔ یہ وہی تو جہاں آرا تھی جس کی رنگت کا کھوج وہ آج تک نہ لگا پایا تھا اس لیے کہ کبھی تو وہ دمک کر خود ہی سنہری ہو جاتی اور کبھی شام کے اولین سایوں پر پھولی ہوئی شفق کی طرح اس پر گلابیاں جھک آتی تھیں۔ پھر بھی اب یہ اس پہلی جہاں آرا سے کتنی مختلف تھی جو اس کو کچھ عرصہ پہلے ملی تھی۔

''انسان جب آسمان کی بلندیوں کی طرف مائل پرواز ہوتا ہے' تو کتنا مختلف ہو جاتا ہے۔'' وہ سوچ رہا تھا۔

جہاں آرا جو ہر روز ہی بلندیوں پر پرواز کرتی تھی آج ڈیوٹی پر نہیں جا رہی تھی بلکہ اس کے ساتھ جو اس کا شوہر تھا' ہنی مون منانے سوئٹزرلینڈ جا رہی تھی۔ جہاں بلندیاں تھیں' نشیب تھے' ڈھلانیں تھیں اور حسن تھا۔

بڑے شوق اور تجسس سے جہاں آرا نے نیچے کی طرف دیکھا' ادھر جہاں کے وطن کی مٹیالی سرزمین تھی' سرسبز اور لہلہاتے کھیت اور بہتے ہوئے دریا تھے۔ چھوٹے چھوٹے خاکستری' سبز اور نیلگوں نقطے اور لکیریں آپس میں گڈمڈ ہوئے جا رہے تھے اور یہ میری سرزمین ہے جو اس وقت نہ جانے مجھ سے ناراض ہے یا میری جدائی پر محزوں' جہاں آرا نے بڑے تجسس سے سوچا۔ اکتوبر کی یہ رات نرم اور خنک تھی' جہاں آرا کی سرزمین پر کیکر پھول رہے تھے۔ ایک مبہم سی خاموش اور سہمی سہمی خوشبو چاروں طرف پھیل رہی تھی اور جہاں آرا اس خوشبو سے بہت دور بلند فضاؤں میں پرواز کر رہی تھی۔ اس کے اور اس گھر کے درمیان طویل فاصلے حائل تھے۔ جہاں آرا

نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں اور اچانک ہی اسے محسوس ہوا کہ بلندی اور پستی کے درمیان تنے ہوئے وہ سارے فاصلے تحلیل ہو گئے کیکر کی وہ سہمی سہمی سی آوارہ خوشبو اس کی نس نس میں سمائی جا رہی ہے اور وہ اپنے گھر کے بند دروازے پر کھڑی کہہ رہی ہے:

''بابل اپنا دروازہ تم کھلا ہی رکھنا۔''

ارے یہ قربتوں اور فاصلوں کا چکر ہے۔ بعض قربتیں فاصلے بن جاتے ہیں اور بعض پھیلے ہوئے فاصلے سمٹ کر ہمارے وجود میں سما جاتے ہیں۔

ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اس کو اپنے سوال کا جواب نہ ملا اور گھبرا کر ماضی کے چھوڑے ہوئے راستوں پر اس کی ذہن سرپٹ دوڑنے لگا۔

وہ بھی اکتوبر کی نرم اور خنک رات تھی جس کو ہوسٹل کی اصطلاح میں انٹروڈکشن نائٹ کہا جاتا ہے' یعنی وہ رات جس میں بستی بستی اور نگر نگر سے آنے والی نئی لڑکیوں کا تعارف کروایا گیا تھا روشنیوں اور قہقہوں کے درمیان نت نئی لڑکیوں کو زبردستی اٹھا اٹھا کر ان کو اپنا تعارف کروانے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ مسخری سی شکل اور شوخ آنکھوں والی لڑکی نے اٹھ کر بڑے اعتماد سے اپنا نام بتایا۔

''عذرا شمیم!''

''تم کو گانا آتا ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''ناچنا آتا ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر کیا آتا ہے؟'' فرخندہ کی کھردری آواز گونجی۔

اور وہ بڑی متانت سے بولی ''بھئی ہمیں تو صرف بخار آتا ہے!''

قہقہوں اور تالیوں کے شور میں عذرا شمیم اس بے نیازی سے اپنی شوخ آنکھیں جھپکا رہی تھی کہ سینئر لڑکی کی ہمت نہ ہوئی کہ اس کا الو کھینچیں' یہ تو ہمیں ہی الو بنا ڈالے گی۔ سینئر لڑکیوں نے کھسر پھسر کر کے صلاح کی۔

اور اب جو دوسری لڑکی تعارف کے لیے اٹھائی گئی وہ جہاں آرا تھی۔ بید کی طرح نازک اور لچک دار قد' گھنیری پلکوں کے سائے میں جھکی جھکی آنکھیں اور نئے لیموں کی سی رنگت والے لباس میں اس کی اپنی رنگت کا کھوج ہی نہ مل رہا تھا۔

''اے جی! اپنی آنکھیں تو اوپر اٹھاؤ یہ کیا ہے؟ یہاں کیا تمہارے سسرالیے بیٹھے ہیں۔'' فرخندہ کی گستاخ اور کرخت آواز پر چونک کر اس نے فوراً آنکھیں اوپر اٹھالیں۔

اور ان آنکھوں نے کتنی ہی لڑکیوں کو سوچ میں ڈال دیا تھا۔

''ارے اس لڑکی کو بھی بیوقوف بنایا جاسکتا ہے!''

اور رخشندہ وصال نے بڑی خاموشی سے سوچا تھا۔

''ارے ان آنکھوں کو تو کسی چیز سے تشبیہ بھی تو نہیں دی جاسکتی۔''

اور رخشندہ وصال کی خوب صورت نظموں کے بغیر کالج میگزین کی تکمیل ناممکن بات تھی۔

پھر رخشندہ کو وہم سا ہوا جیسے اس کو کوئی بات یاد آرہی ہو۔

ہاں برف پوش پہاڑوں کی اچھوتی چوٹیوں پر جیسے کسی نے گیان کی شمعیں روشن کر رکھی ہوں۔

''نام بولو اپنا۔'' فرخندہ کی گستاخ اور کرخت آواز پھر گونجی۔

''جہاں آرا۔'' یہ آواز ٹھہری ہوئی نرم گہری اور خاموش کا عنصر لیے ہوئے تھی۔

''چلو جہاں آرا ہمیں اپنا گانا سنا۔''

اس کی آنکھیں پھر جھک گئیں۔ ''میرا گلا خراب ہے۔'' اس نے اپنا نرم اور نازک ہاتھ گلے پر رکھ لیا۔

اس کی آواز اور آنکھوں دونوں ہی میں صداقت تھی۔

ہوسٹل کا ناقابل اعتبار گھی بہت سے گلوں کو آزما رہا تھا۔

''بھئی کیا بات کہہ دی۔ خراب گلے سے نکلی ہوئی کرکری اور بیٹھی ہوئی آواز میں گایا ہوا گانا تو آج کی رات سیدھا فرشتے کی بارگاہ میں جاتا ہے۔'' فرخندہ کی آواز فیصلہ کن تھی۔

اور رخشندہ کو پہلی بار محسوس ہوا کہ اس رات ضرورت سے زیادہ نو وارد لڑکیوں کو پریشان کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ جہاں آرا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بڑی بے بسی سے گلے پر ہاتھ پھیر رہی تھی جس پر ایک سفید رومال بھی اس نے لپیٹ رکھا تھا۔

جہاں آرا نے ایک بار پھر پوری آنکھیں کھول کر لڑکیوں کی طرف دیکھا۔

''اور ایک اور لڑکی بیوقوف بنائے بغیر بٹھادی گئی۔''

اس رات جب ہوسٹل کی روشنیاں بجھ بجھ کر تاریکی میں تحلیل ہونے لگی تھیں' تو جہاں آرا سید نے اپنے چھوٹے سے کمرے کی کھڑکی کے باہر نظریں دوڑائیں۔ باہر کی فضا اور اس کے درمیان کھڑکی کی مضبوط اور باریک جالی حائل تھی۔ پھر بھی سیاہ رات کی خوشبو اس کی روح سے ہم کنار تھی۔ نرم نرم سی خنکی لیے ہوئے خاموش رات میں کیکر پھول رہا تھا اور اس کی تیز خوشبو اس کے دماغ میں گھسی جا رہی تھی۔

سوں ہاں! جہاں آرا نے فضا میں بکھری ہوئی تمام خوشبو کو اپنے وجود میں سمیٹ لینے کی کوشش کی۔

اوہ! کیکر کی یہ خوشبو تو بال آخر میرے ساتھ ساتھ ہے۔ رات کی تنہائی اور سناٹے میں اس جانی پہچانی خوشبو کو اپنے قریب پا کر ایک ان جانی سی خوشی محسوس ہو رہی تھی اور یہ خوشبو اس کو اسی لمحے گھر اور اس کے جانے بوجھے ماحول کے کتنا قریب لے گئی تھی۔

بعض فاصلے کتنے نزدیک ہوتے ہیں' یہ بات اس دن اور اس عمر میں بھی جہاں آرا نے سوچی۔ چھوٹا سا خام اور ناتجربے کار ذہن اپنے سوال پر خود ہی الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس نے فوراً آنکھیں بند کر لیں اور اس کو محسوس ہوا جیسے وہ اپنے مختصر سے مکان میں چل پھر رہی ہو۔ اندھیرے میں سوئی ہوئی بہن اور امی کے پلنگوں کے درمیان دھیرے دھیرے گزر رہی ہو۔ یہ گڈو کا پلنگ ہے اور وہ پپو کا' امی کی چارپائی کے قریب چھوٹی سی پلنگڑی پر سوئی ہوئی حسن آرا۔ پتا نہیں اب میں جو یہاں آ گئی' تو سب کو کیسا لگ رہا ہوگا' صبح ہی صبح وہ حسنا کو گود میں لے کر تیار کرتی' سفید چینی کے گلاس میں گرم گرم دودھ ڈال کر اس کو پلا ہی رہی ہوتی کہ امی کی آواز سنائی دیتی وہ جاگتے ہی اس کو آواز دیتی تھیں:

''امی جی' لوٹے میں وضو کا پانی رکھا ہے۔''

گھر میں ایک ہی تو ملازم تھا کدھر کدھر دوڑتا۔ اسکول جانے سے پہلے وہ ڈھیروں کام کر لیتی۔

گڈو پپو اسکول کے لیے کس مشکل سے تیار ہوتے' کتنی ہی بار کان مسلنے اور چپکے لگانے کی ضرورت پیش آتی اور کتنی بار ہی امی سے رجوع کرنا پڑتا۔

''امی جی' یہ گڈو نہیں مانتا۔''

''ہوں! ہوں! مار'' امی وظیفہ پڑھتے پڑھتے دانت بند کیے بھنچی بھنچی سی آواز نکالتیں تاکہ کھلی زبان سے بولنے میں ورد نہ ٹوٹ جائے۔

اپنے شوہر کی آواز پر جہاں آرا نے کسمسا کر آنکھ کھول دی۔ مسکراتی ہوئی ایئر ہوسٹس کافی' خشک میوہ اور نمکین بسکٹ لیے

ہوئے ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بالکل وہی یونیفارم جو کل تک اس نے خود پہن رکھی تھی اور وہی پرتپاک تبسم۔ مگر یہ کوئی بالکل وہی یونفیارم جو کل تک اس نے خود پہن رکھی تھی اور وہی پرتپاک تبسم۔ مگر یہ کوئی بالکل اجنبی چہرہ تھا' شاید پہلی مرتبہ یہ ڈیوٹی پر آئی ہے۔ جہاں آرا نے سوچا اور سر جھکا لیا۔ اس نے مانگ میں افشاں چنی ہوئی تھی اس کے سہاگ کی واحد نشانی' سیاہ چمکیلے بادلوں کے درمیان مانگ میں ستارے سے جھمک رہے تھے۔

''شاید تمہاری حال ہی میں شادی ہوئی ہے! تم کتنی خوش نصیب ہو مگر تمہارا شوہر کدھر ہے۔'' کم سن اور ہنس مکھ ایئر ہوسٹس نے سوچا اور تجسس سے ادھر ادھر دیکھا'' اور دیکھو مجھے کب تک اس وقت کا انتظار کرنا پڑے گا جب میری مانگ میں بھی ایسے ستارے جھلملائیں گے۔''

''تم کافی نہیں لوگی۔'' وہ بڑی توجہ سے اپنی بیوی سے مخاطب تھا۔

''ارے' یہ کیا؟ ایئر ہوسٹس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹرے کو خفیف سی جنبش ہوئی اور اس نے پوری کھلی آنکھوں سے اس کے شوہر کو اور پھر اس کو دیکھا۔

''نہیں۔'' جہاں آرا کا مختصر جواب تھا جو مڑتی ہوئی ایئر ہوسٹس سے آنکھیں چرائے باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کافی بڑی مزے کی ہے!'' وہ بڑے شوق سے کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔

اور جہاں آرا نے دل میں کہا'' ہاں تم پیو۔ میں کب چائے' کافی کی عادی تھی۔'' اچانک ہی اس کو نیم کی چھاؤں میں بنی ہوئی چبوتری کا دھیان آ گیا جس پر ہر صبح شام مٹی کی انگیٹھی میں سلگتے ہوئے اپلوں پر جوش کھاتے ہوئے دودھ کی سوندھی سوندھی خوشبو گھر بھر میں پھیلی ہوتی تھی۔ اسکول جانے سے پہلے وہ اسی چبوتری پر رکھی ہوئی پیڑھی پر بیٹھ کر گلاس میں اجلا اجلا گرم بالائی ملا دودھ ڈال کر پھونکیں مار مار کر پیتی تھی اور پھر کسی چٹیا باندھے' بستہ اٹھائے موٹی ململ کا دوپٹہ سر پر لیے اسکول جایا کرتی تھی۔ مشن اسکول کے چھوٹے سے صاف ستھرے اسکول میں سیاہ فام' چڑچڑی اور مہربان استانیوں کے درمیان وقت کتنے سکون سے گزر رہا تھا۔ زندگی اسکول کے احاطے کے جامن کے درخت اور رنگ برنگی پھولوں کے درمیان آرام سے گزر رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی معصوم شرارتوں میں انھیں وقت کا پتا بھی نہ چل پایا تھا۔ اب اس وقت بھی اس بلندی پر پرواز کرتے وقت جہاں آرا کو یہ سب کل کی باتیں معلوم ہو رہی تھیں جب وہ حساب کی لنگڑی اور چڑچڑی مسز فریزر کی صاف ستھری ساریوں پر ہر روز قلم جھٹک کر گلکاری کر دیا کرتی تھی اور انھیں مطلق خبر نہ ہوتی اور پھر صبح صبح اسمبلی میں آسمانی باپ کی باتیں بتانے والی بوڑھی اور موٹی مس ہارورڈ جو کسی زمانے میں سچ مچ یورپین

تھیں اور اب تو یہاں کے مشن میں کام کرتے کرتے ان کا رنگ بھی بھورا ہو چلا تھا۔ چہرے کی جھریوں میں بے شمار سیاہ اور بھورے تل الجھے نظر آنے لگے تھے' البتہ عینک کے نیلگوں شیشوں میں جھانکتی ہوئی آنکھیں عبدالرحیم سید کی اس لڑکی جہاں آرا سید سے خصوصی محبت اور خلوص تھا۔ اس یقین کے باوجود کہ عبدالرحیم سید کے گھر کی لونڈی بھی ان کی باتوں پر کبھی ایمان لا سکتی ہے اور نہ تثلیث کے آگے سر جھکائے گی' ان کے دل میں اجلے اور بے داغ شجرے والے خاندانوں کا احترام تھا۔ ان کے اپنے خاندانی شجرے کی سیڑھی کا ہر ڈنڈا بے جوڑ اور ستھرا تھا۔ ان کو عبدالرحیم سید کا وہ نسلی غرور بہت پیارا لگتا تھا اور وہ ان کے اس غرور کا دل سے احترام کرتی تھیں۔

جہاں آرا سید کو ان کی خاص توجہ نے نہ صرف میٹرک میں وظیفہ دلوایا بلکہ انگریزی کے اتنے ستھرے لب ولہجہ پر قادر کر دیا تھا کہ وہ کسی اعلیٰ درجے کے کونونٹ کی پڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور کالی رنگ والی عیسائی لڑکیاں اس حقیقت سے واقف تھیں کہ مس ہارورڈ بے داغ خاندانوں کو بڑی اہمیت دیتی ہیں۔ پھر بھی انھیں جہاں آرا سید سے کوئی رشک وحسد نہ تھا۔ ان کی رائے میں وہ بڑی حلیم اور منکسر مزاج لڑکی تھی اور ان میں سے اکثر سے کم حیثیت اور یہ مس ہارورڈ ہی کی کوشش اور اصرار تھا جو وہ اس بڑے ہوسٹل میں بھیجی گئی تھی۔ گرچہ اس میں عبدالرحیم سید کی آرزو کو بھی بڑا دخل تھا۔ ان کے اپنے چچازاد بھائی کی دو دو لڑکیاں اسی کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ ان کو بھی تمنا تھی کہ ان کی لڑکی اعلیٰ درجے کی خاتون خانہ اور معاشرتی علوم سے بہرہ ور ہو۔

جہاں آرا کے وظیفے اور اپنے مختصر سے ستھرے کاروبار کی آمدنی کے کچھ حصے کو ملا کر وہ باسانی اس کو بھیج سکتے تھے' تو پھر وہ مس ہارورڈ کا کہنا کیوں نہ مانتے حالانکہ امی جی تو برابر چیختی رہی تھیں:

''بس بہت پڑھ لیا۔ کوئی ضرورت نہیں گھر سے اتنی دور رہنے کی۔ بس جی تم تو اب اس فرض سے ادا ہونے کی سوچو۔''

''کب عمر آئے گی جب پر لگ جائیں گے بورڈنگ میں رہ کر۔''

۔۔۔۔۔۔ مگر عورتوں کی کون سنتا ہے؟ البتہ مس ہارورڈ جیسی عورتوں کی تو بات دوسری ہوتی ہے۔ جہاں آرا نے بھی تو باپ کا ساتھ دیا تھا اور اس رات جب وہ تصور ہی تصور میں اپنے گھر پہنچی تھی تو اس کو اپنی سوتی ہوئی ماں پر بڑا پیار آیا جن کی وقت ناوقت کی نصیحتیں اور باتیں اس کو بری بھی لگ جایا کرتی تھیں اور اس کے وجود میں اس طرح سما گئی تھیں کہ اب کسی دوسرے خیال کی تو الگ بات ہے تل دھرنے کی جگہ باقی نہ تھی۔ یادوں اور تصورات کے اتنے بڑے ہجوم کو انسان اچانک ہی دھکا دے کر نہیں نکال دیتا اور اسی وجہ سے جہاں آرا سید جو اس ہوسٹل میں بڑے ارمانوں اور چاؤ سے آئی تھی' ابھی تک اکھڑی اکھڑی تھی۔

ہوسٹل کی روشنیاں یکے بعد دیگرے بجھتی جا رہی تھیں اور اب گراؤنڈ میں مکمل اندھیرا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر دیوار پر

آویزاں کیے ہوئے ڈیڑھ فٹ لمبے اور آدھ فٹ چوڑے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے جوڑے کی پنیں دھیرے دھیرے نکال کر میز پر رکھنے لگی۔ جوڑے کی بندشوں سے گھبرائی ہوئی لٹیں پھسل پھسل کر اس کے شانوں پر گرنے لگیں۔ یہ پنیں زہرہ نگہت کو واپس کرنا ہیں۔ اس نے خود کو یاد دلایا۔ آج پہلی مرتبہ زہرہ نگہت نے اپنی پنوں کی مدد سے اس کا جوڑا بنایا تھا۔ جہاں آرا نے اپنے لانبے سیاہ نرم بالوں پر پیار سے انگلیاں پھیریں۔ ہوسٹل کی لڑکیوں کے بال کیسے پیارے اسٹائلوں سے کٹے اور سجے ہوئے ہیں۔ اس نے رشک سے سوچا تھا۔

بے خیالی میں اس کا ہاتھ اپنے بالوں پر گیا جو اب جدید ترین اسٹائل میں بہت اونچے کیے تھے۔ ''اوہ'' بے خیالی میں اس کے منھ سے نکلا۔

''کیوں ڈرالنگ کیا بات ہے؟'' اس کے شوہر نے بڑی مستعد توجہ اور نرمی سے دریافت کیا۔

''نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔'' اور وہ سوچ رہی تھی کہ اگر وہ ایئر ہوسٹس نہ ہوتی تو کتنی آسانی سے کہہ سکتی تھی کہ طیارے کی پرواز میرے اعصاب پر اثر کر رہی ہے۔

''میرا خیال ہے تم ایک چیونگ گم کیوں نہ آزما کر دیکھو۔'' وہ خوش دلی سے مسکرائی اور پھر اس نے چپکے سے سوچا۔

ہاں بس، مجھے ایسی محبت سے لبریز نرم نرم آنکھوں کی ضرورت تھی۔ تمہیں نہیں معلوم محبت اور مفاہمت کا فقدان انسان کو کتنا بے سہارا کر دیا کرتا ہے اور تمہاری یہ پر لطف نگاہیں۔ واقعی۔۔۔۔۔۔۔

''مجھے تمہاری تمنا تھی، مجھے تمہاری ضرورت ہے اور شاید تم سے محبت بھی ہے۔''

اور وہ حیران تھا کہ وہ جو کل تک اتنی باتونی اور ہنس مکھ تھی آج اتنی خاموش کیوں ہے۔ اس کے وجود پر یہ کیسا اسرار طاری ہے اور ان آنکھوں میں گیان اور دھیان کی یہ کیفیت کیوں ہے۔۔۔۔۔۔۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ یہ وہی لڑکی تھی، وہی اس کا اپنا پیکر، وہی جانے بوجھے خدوخال، پھر بھی آج یہ ہر روز سے کتنی مختلف نظر آ رہی تھی۔

''انسان جب بلندیوں کی طرف پرواز کرتا ہے، تو کتنا بدل جاتا ہے۔'' شاید یہی بات ہے اور وہ پھر مطمئن ہو کر اپنے پرواز کرتا ہے، تو کتنا بدل جاتا ہے۔'' شاید یہی بات ہے اور وہ پھر مطمئن ہو کر اپنے رسالے میں گم ہو گیا۔ اس لیے کہ اس کی بیوی اس کے ساتھ ہنسنے بولنے کے موڈ میں نہ تھی۔

اور جہاں آرا کو وہ سارے واقعات یکے بعد دیگرے بڑی تفصیل سے منزل بہ منزل یاد آ رہے تھے جنھوں نے رفتہ رفتہ اس کو

اپنوں سے بیگانہ اوران کی ہمدردی اور مفاہمت سے محروم کر دیا تھا اور وہ اب تک یہ فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ قصور کس کا تھا۔

ہوسٹل کے جس واقعے نے سب سے پہلے جہاں آرا سید کی خود اعتمادی اور بے نیازی کو صدمہ پہنچایا' وہ فرینڈ شپ ویک کی دلچسپ روایت تھی۔ ایک شام چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر لڑکیوں کے نام لکھ کر قرعے کے ذریعے ناموں کے تبادلے کیے گئے جن کو صیغہ راز میں رکھ کر خیر سگالی اور دوستی قائم جاتی' یعنی گم نام اور نامعلوم دوستوں کی جانب سے چھوٹے موٹے دوستانہ تحفے اور سلوک اور پھر ایک ہفتے کے بعد یہ اچانک انکشاف کہ اس سب عطا اور مہربانی کی تہ میں کون تھا۔

تمام ہفتے لڑکیوں کو وقت ناوقت اپنے کمروں میں رکھے ہوئے غیر متوقع تحفے ملتے رہے۔ تحفے' ان جانی مہربانیاں اور نامعلوم سلوک پورے ہوسٹل پر بارش کی خوش گوار اور بھینی بھینی پھوار کی طاری برستے رہے۔

ایک صبح جہاں آرا کو اپنی میز پر شینل جیسے قیمتی سینٹ کی شیشی رکھی ہوئی ملی اور وہ اس کی قیمت کا صحیح اندازہ بھی نہ لگا پائی' البتہ یہ خوشبو اگلی اور پچھلی تمام خوشبوؤں سے زیادہ لطیف اور مست کن تھی اور اسی دوپہر کو شہناز لطیف نے ''کوری ڈور'' میں کھڑے ہو کر دہائی دی' ''ارے بھئی' وہ میری نامعلوم دوست کدھر سوئی ہوئی ہے' کچھ اس کو خبر بھی ہے کہ مابدولت کی روشنائی کھ ہو گئی ہے۔'' اس شام جہاں آرا سید چپکے سے روشنائی کی شیشی رکھنے شہناز کے کمرے میں گئی' تو اس کے قدم ٹھٹک گئے اور اس نے سوچا تھا کس قدر غلط قرعہ پڑ گیا تھا۔ بھلا شہناز لطیف کا اور اس کا بھی کوئی جوڑ تھا۔ وہ عنابی پردوں' کافوری قالین اور قیمتی فرنیچر سے آراستہ کمرے میں ایک بھٹکے ہوئے راہی کی طرح سراسیمہ کھڑی تھی۔ اس کے مقابل شہناز کی قیمتی اور نفیس ڈریسنگ ٹیبل تھی جس پر میکس فیکٹر کا ہر سامان موجود تھا۔ شفاف بلوری آئینے میں اس نے اپنا گھبرایا ہوا عکس دیکھا اور اس کو یعنی خوب صورت آنکھوں والی جہاں آرا سید کو مس ہارورڈ کی سنائی ہوئی بہت پرانی کہانی یاد آ گئی جو جاڑے کی ایک رات انہوں نے اپنے آتش دان کے قریب بیٹھ کر اس کو سنائی تھی۔ اس کے کانوں میں مس ہارورڈ کی آواز گونج گئی۔ ''بس تو جہاں آرا' اس غریب چمنی صاف کرنے والے لڑکے نے جب اس خوبصورت اور شفاف آئینے میں اپنا میلا کچیلا عکس دیکھا' تو اس نے سوچا کہ اگر اس پیاری پیاری سی خوبصورت بچی نے اس کو دیکھ لیا تو کیا کہے گی۔ اس خیال سے وہ اتنا سراسیمہ ہوا کہ بوکھلا کر کھڑکی کے باہر کود گیا۔ کھڑکی کے باہر ایک دریا بہتا تھا۔ غڑاپ سے وہ پانی کے اندر پہنچا۔ پانی کی شفاف موجوں نے اس کو نہلا دھلا کر ''جل بچہ'' بنا دیا اور وہ جل بچوں کے ساتھ مل کر اس میلی کچیلی چمنیوں کی کالک اور دھویں دانی دنیا کو بھول گیا۔'' ''واٹر بے بی'' کی یہ کہانی اس کے ذہن میں ابھری۔ وہ روشنائی کی شیشی جلدی میں ڈریسنگ ٹیبل ہی پر چھوڑ کر باہر نکل گئی۔ سچی کے نیلے اور سنہری گل دان میں سجی ہوئی زرد گلاب کی کلیاں جہاں آرا سید پر کھڑکی کے پردے کی آڑ سے مسکرائیں اور

لرز کر رہ گئیں۔

اس رات کے زیادہ حصے میں وہ اپنے اور شہناز لطیف کے فرق پر غور کرتی رہی۔ اونہہ! یہ ہوسٹل والے اتنے بڑے بڑے گھروں کی لڑکیوں کو کیوں داخل کر لیتے ہیں اور جو کر لیتے ہیں' تو پھر ان کو اتنے ٹھاٹ باٹ سے رہنے کی اجازت کیوں دیتے ہیں۔ کم سے کم اس زندگی میں تو یکسانیت ہو۔ اب اس کا دل گم نام دوستی کی اس دلچسپ روایت سے بھی کھٹا ہو گیا تھا۔ جب اس پر راز کھلے گا کہ کوکا کولا کی بوتل' سانچی پان کی گلوری اور اسپرو کے پیکٹ جیسے بے حقیقت تحفے دینے والی' وہ یعنی جہاں آرا ہے' تو وہ اس کو کتنا حقیر سمجھے گی۔ کاش! ہوسٹل کی دیوار کے پاس شفاف پانی کا بہتا ہوا دریا ہوتا۔

دن کے مختلف حصوں میں گم نام تحفوں اور خدمات کے شکریے اونچی آواز میں ہوا کے سپرد کر دیے جاتے۔ جہاں آرا سید کو قریباً ہر روز ایک قیمتی تحفہ ملتا رہا۔ اور اس کا خون خشک ہوتا رہا۔ اللہ میرے میں ان سب کا بدلہ کیسے اتاروں گی۔ میری اور اس کی دوستی کیسے نبھے گی۔ فکر مندی اس کی آنکھوں کو اور بھی خوبصورت بنا دیتی۔ ڈائننگ روم میں رخشندہ وصال کی ایک دوست نے دھیرے سے کہا' ''یہ پراسراری آنکھوں والی لڑکی کبھی کبھی اپنی عمر سے زیادہ فکر مند اور سنجیدہ نظر آتی ہے۔''

''ہاں اور میں نے سنا ہے اس کو میٹرک میں اسکالرشپ ملا ہے۔''

رخشندہ وصال اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

رخشندہ وصال ہر سال اسکالرشپ لیتی تھی۔ اس کے باپ نے اس کی ماں کی وفات کے بعد ایک ڈچ عورت سے شادی کر لی تھی۔ وہ اور اس کا بھائی سلمان دونوں ہی اسکالرشپ کے علاوہ ریڈیو سکرپٹ اور ٹیوشنوں کے ذریعے اپنے باپ کی بھیجی ہوئی مختصر رقم میں گزر کرتے تھے اور اس کا بھائی اب ملٹری اکیڈمی میں کیڈٹ تھا۔

رخشندہ' اسمارٹ ذہین اور بااصول لڑکی تھی اور جہاں آرا سیدس بہت سینئر۔ دو ہی دن میں اس کے لباس اور عادتوں سے اس کی حیثیت اور گھرانے کا اندازہ لگا چکی تھی۔

اس رات اس نے اپنے مختصر سے سادہ مگر بہت ہی خوبصورتی سے سجائے ہوئے کمرے میں بیٹھ کر سلمان کو خط لکھا تھا۔

''جہاں آرا سید اتنی اچھی اور مناسب لڑکی ہے کہ بس' اور اب تو جھٹ پٹ اپنا کورس ختم کر ڈالو اور اتنے میں اس سے ربط ضبط بڑھاؤں گی۔ اس کو دیکھ کر بس ایک ہی خیال آتا ہے کہ بعض خاندانی لوگ اپنی غربت کی کمی اپنی اولاد کی تربیت میں پوری کر دیتے ہیں۔ سنا ہے اس کی باپ عبدالرحیم سید کو اپنے نسب اور خاندان پر بڑا ناز ہے۔''

اس خط کی بات جہاں آرا کو بہت بعد میں معلوم ہوئی تھی۔

''ابھی تو تم کی منی آرڈر کیا تھا اور اب تم پھر روپوں کا مطالبہ کر رہی ہو؟'' اباجی کی آواز میں اس مرتبہ کوفت اور جھنجلاہٹ کا شائبہ تھا۔

''تمام لڑکیاں ویلکم پارٹی کے لیے نئے جوڑے بنوا رہی ہیں۔''

''وہ پاگل ہیں۔ میرا مطلب ہے وہ بڑے باپوں کی بیٹیاں ہیں اور تم۔۔۔۔۔۔۔تم ایک معمولی آدمی کی بیٹی ہو۔'' وہ جھلا کر ملاقات کا وقت ختم ہونے سے پہلے ہی اٹھ آئے۔

پاگل تو وہ ہوا نا۔۔۔۔۔۔۔جو غلط جگہ پر۔۔۔۔۔۔۔اچانک ہی عبدالرحیم سید کی بیٹی کو احساس ہوا کہ اس کے طرز فکر میں گستاخی کا عنصر غالب آ رہا ہے اور اس نے بہت جلد اپنی سوچ کا سلسلہ ختم کر دیا اور اپنے باپ کو جاتا ہوا دیکھتی رہی' معمولی کپڑے کا اسمارٹ کا ستھرا سوٹ اور سفیدی مائل داڑھی۔ متین خوبصورت آنکھیں فکر مندی سے دھیرے دھیرے گیٹ کے باہر نکل گئیں۔

سر کی آواز کے ساتھ ٹائم میگزین نیچے گرا اور جہاں آرا نے چونک کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا جو سیٹ سے تکیہ لگائے غافل سو رہا تھا۔ خوبصورت اور آسودہ چہرے پر چھائی ہوئی نیند کتنی پر تسکین آ رہی تھی۔

جھلملاتے ہوئے تاروں کے درمیان فضا چپ چاپ تھی۔ نیچے سمندر ساکت تھا اور اب اباجی عشا کی نماز ختم کر کے بلند آواز میں پڑھ رہے ہوں گے۔

صاحب قاب قوسین محبوب رب المشرقین والمغربین جد الحسن والحسین مولانا و مولی الثقلین ۔ حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ جد ان کا اپنا بھی تو جد اعلیٰ تھا جب ہی تو درود کا یہ حصہ پڑھتے وقت ان کا چہرہ دمکنے لگتا تھا۔ ابی القاسم محمد بن عبداللہ اور امی جس کام میں بھی مشغول ہوں گی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سن کر دونوں انگوٹھوں کے ناخون جوڑ کر چٹ سے چومیں گی اور آنکھوں سے لگالیں گی۔ اس نے سوچا اور پھر اس کے ذہن نے دہرایا۔

ابی القاسم محمد بن عبداللہ' اس نے بلا ارادہ اپنے انگوٹھوں کے ناخون جوڑ کر چٹ سے چوم لیے اور اس کے پیچھے بیٹھے ہوئے امریکن نے اس کے چہرے کو بغور دیکھ کر اس کے ہوش و حواس کو تاڑا۔۔۔۔۔۔۔اور پھر ببل گم منہ میں سمیٹ کر اپنی کتاب میں مشغول ہو گیا۔

رخشندہ وصال کا بھائی بھی اسی جیسا تھا۔ معمولی شکل و صورت کا ذہین اور توانا لڑکا۔ سادہ اور خاموش عادتیں جب اس دنیا میں اس

قدر ہڑبونگ' دھما چوکڑی اور چمک دمک آنکھیں چوندھیائے دیتی تھی۔

جہاں آرا سید کو یوں لگا جیسے برگد کے پرانے اور گھنیرے سائے تلے چلتے چلتے رک گئی ہو۔

رخشندہ وصال ہمدرد تھی لیکن خاموش قسم کی' تحفے لینے اور دینے کی استطاعت بھی نہ رکھتی تھی جب کہ دوسری لڑکیاں ہر بہانے تحفوں کی بارشیں ایک دوسرے پر کرتی رہتی تھیں اور پھر وہ سینئر تھی' اس لیے بھی اس کے بہت قریب نہ آسکی تھی۔ پھر بھی رہتی تھیں اور پھر وہ سینئر تھی' اس لیے بھی اس کے بہت زیادہ قریب نہ آسکی تھی۔ پھر بھی سلمان جو کبھی کبھار رخشندہ سے ملنے آیا کرتا تھا' اس کو متاثر کرتا رہا۔

''پتا نہیں اس لڑکی کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ چاہتی ہے سب کا گلا کاٹ کر اسی کا پورا کیے جاؤں۔ کسی قسم کی کمی اپنے خرچ میں کرتی۔''

عبدالرحیم سید نے پہلی مرتبہ اپنی بیوی سے جہاں آرا کی شکایت کی۔

''ہاں تو پھر اب بھگتو۔ میں کیا کہتی تھی۔ اپنے گھر کی ہو جاتی' تو دو بچوں کی ماں بن چکی ہوتی۔''

''تم ایک حماقت کی بات کہتی ہو۔ وہ عمر اس کی شادی کی تھی!''

''اب تو ہے! لاؤ آج میں خالہ جی سے ہاں کر دوں۔ راج راجے گی۔ خالد غلامی کرے گا۔''

وہ چپ ہو رہے۔

مگر اب جہاں آرا کو خالد کی غلامی کب منظور تھی۔ اس کو واقعی سلمان سے انسیت ہو چلی تھی۔ رفتہ رفتہ رخشندہ اس پر یہ ظاہر کر چکی تھی کہ جب تک وہ اپنی تعلیم ختم کرے گی سلمان کو کمیشن مل جائے گا۔

سلیمان کے خاندان پر تو عبدالرحیم سید کو اعتراض نہ تھا۔ اگر تھا تو اپنی لڑکی کے پٹاپٹ بولنے پر' وہ خون کے سے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اس مرتبہ ان کی داڑھی کچھ اور سفید ہو گئی تھی۔

اور ان کے گھر میں تو جیسے کسی نے سیہی کا کانٹا کانٹا ڈال دیا تھا۔ باپ بیٹی میں جھگڑے بڑھتے جا رہے تھے اور ماں بچاری چکی کے دو پاٹوں کے بیچ گھن کی طرح پس رہی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ تم ابا جی کو سمجھاؤ۔

اور وہ کہتے تھے: ''اس کم بخت سے کہو کہ اپنے طریقے درست کرے اور ہاتھ روک کر خرچ کرے ورنہ بخدا میں ہاتھ کھینچ لوں گا۔ پڑھائی بند کر دوں گا۔''

امی کی زندگی روتے کٹ رہی تھی۔ اچانک ہی ان کی کوکھ سے پیدا ہونے والی لڑکی سرکش اور آزاد ہو گئی تھی اور آزاد ہو گئی تھی اور

جب انہوں نے جہاں آرا کو بتایا کہ پڑھائی بند کرنے کو کہتے ہیں' تو وہ بولی: ''ٹھیک کہتے ہیں' لیکن اپنی غلطی کا احساس انہوں نے دیر سے کیا ہے۔''

اور انہوں نے تو فقط دھمکی دی تھی۔ اگلی مرتبہ ہوسٹل مرتبہ ہوسٹل کھلنے پر اس کو پھر بھیج دیا۔

لیکن اب اس پر خود بہت سی حقیقتوں کا انکشاف ہو چکا تھا میری ہوسٹل کی زندگی میں کھپت نہیں ہے۔ اس کے تقاضے اور معیار بہت اونچے ہیں اور اب میری گزر گھر کی چار دیواری میں بھی نہیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔

انٹرویو کے فوراً بعد ہی اس کو بتا دیا گیا تھا کہ وہ منتخب ہو گئی اور اب ایئر ہوسٹس کی تربیت لینا ہے۔۔۔۔۔۔۔ اور اس بات کی خبر اس نے رخشندہ وصال کے سوا گھر والوں کو بھی نہ کی۔

اور رخشندہ وصال کو محسوس ہوا جیسے برفانی چوٹیوں پر جلتی ہوئی گیان کی شمعوں کو کسی نے پھونک مار کر بجھا دیا ہو۔

سلمان نے سنا تو رخشندہ کو لکھا' میرے کمیشن ملنے تک تم اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ تم اس کو سہارا دیے رہنا' چلو اس کی ضد بھی پوری ہو جائے' مگر ہوا یوں کہ اس نے اپنے سارے سہارے یکے بعد دیگرے خود ہی توڑ دیے۔ ابا جی اور ان کی زبردستی امی سے ناطہ کیا ٹوٹا' وہ ہر کسی سے بدظن ہوتی چلی گئی۔ رخشندہ کی ہمدردی اور محبت کے بھی وہ الٹ معنی لیتی۔ بعض وقت اس کو محسوس ہوتا کہ دنیا والوں سے اس کا کوئی ناتا ہی باقی نہیں۔ جب تک وہ زمین پر چلتی' پھرتی' اٹھتی بیٹھتی۔ بے چین اور سراسیمہ رہتی جیسے اس کا کچھ کھو یا گیا۔

اور پھر جب وہ سفید اور سبز وردی میں فضا میں پرواز کرتی' تو اس کو محسوس ہوتا کہ اس کو کوئی پریشانی نہیں۔ اوپر کی فضا میں وہ سکون رہتی اور کبھی کبھی اپنے آپ سے کہتی: ابا جی کے بقول اب مجھے پر لگ گئے ہیں' لیکن مجھے تو کوئی شہ پر دلا دے جو میں بلندیوں ہی کی طرف پرواز کرتی رہوں اور زمین کی پستیوں سے میرا کوئی واسطہ ہی نہ رہے' اس لیے کہ زمین میں چھوڑے اور توڑے ہوئے ناتوں کی زنجیریں اس کو جکڑ لینے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔ اس نے جب بھی گھر کا تصور کیا اس کو اپنے گھر کا دروازہ بند ہی ملا۔

ہر ہفتے وہ کسی نہ کسی نئے ملک کا چکر کاٹ کر آتی۔ وہاں کی زندگی میں اپنے آپ کو گم کر دینے کی کوشش کرتی' لیکن جوں ہی اس کے قدم زمین سے ٹکراتے' اس کا ذہن گنگ اور سن ہو جاتا اور ایسے ہی میں اس کو جم فیلڈن ملا۔ ان بے شمار غیر ملکیوں میں سے ایک تھا جن سے وہ دوران پرواز میں دو چار ہوتی' جن کے ساتھ وہ ہنستی بولتی اور مانوسیت کا برتاؤ کرتی اور جوں ہی ان کے قدم زمین سے ٹکراتے وہ نئی راہوں میں گم ہو جاتے۔ ان کے راستے بدل جاتے اور پھر اس کا گنگ اور مفلوج ذہن پکار اٹھتا:

''ارے مجھے کوئی شہ پر لا دیتا' تو میں کبھی پستیوں کی طرف نہ آتی'' لیکن اس مرتبہ جب اس کے قدم زمین سے ٹکرائے تو ماہر تعمیرات جم فیلڈن دھیرے سے اس کی قریب آیا اور اس کو اپنا کارڈ دے کر بولا: ''تم تو یہاں ایئر پورٹ پر اکثر ملا کرو گی نا۔''

اور جب وہ محکمے کی طرف سے آئی ہوئی جیپ میں بیٹھا ہوا اپنی رہائش گاہ کی طرف جا رہا تھا' تو تارکول کی سیاہ سڑک کے دونوں طرف کھڑے ہوئے سرسبز درختوں کو دیکھ کر اس نے سوچا تھا ''برا تو نہیں ہے اس پراسرار آنکھوں والی ایئر ہوسٹس کا وطن۔''

اور پھر یہ ہوا کہ اس نے بیرون ملک جانے کی ڈیوٹیاں لینا بند کر دیں۔

جارج فیلڈن کی مسکراتی ہوئی معصوم شوخیوں سے لبریز آنکھیں بہت دن نہ دیکھو تو پتا نہیں کچھ برا ہی سا لگتا ہے اور فیلڈن کے گھر میں اس کی تمناؤں اور خواہشوں اور ان سارے خوابوں کی تعبیریں موجود تھیں جو اس نے کالج کے ہوسٹل میں رہ کر دیکھنا سیکھے تھے۔ وہ تمنائیں اور خواب جن کو سن کر اس کی ماں نے بڑی تشویش سے کہا تھا کہ اس لڑکی کا گزر تو اب کسی وزیر ہی کے یہاں ہو سکتا ہے۔ نا بھئی ایسی تعلیم سے باز آئے کہ لڑکی زمین پر پیر نہ دھرے۔

عجیب ضدی لڑکی تھی۔ یہ خود تو کبھی نماز تک نہ پڑھتی تھی' پر جب وہ اس کو شادی پر مجبور کرتا تو مچل جاتی۔

''بھئی تم مسلمان ہو جاؤ۔''

''خوب میں کیا فالتو ہوں جو مسلمان ہو جاؤں۔'' وہ سوچتا۔ اور آخر ایک دن اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ اچھا چلو یہی سہی۔ ''میں نماز وماز نہیں پڑھا کروں گا۔''

''مت پڑھنا۔''

''تو پھر فائدہ مسلمان ہونے سے۔''

''جی میں سیدزادی ہوں۔ مسلمان سے شادی کروں گی۔'' اچانک ہی عبدالرحیم سید کا نسبی غرور اس کے اندر بیدار ہو جاتا۔

''اچھا پھر روزے تو نہیں رکھواؤ گی؟''

اس کم بخت کو اتنی ساری باتیں بتا کر کس نے پکا کر دیا ہے۔ وہ سوچتی ورنہ جھٹ مسلمان ہو جاتا پھر رفتہ رفتہ آپ ہی سب کچھ کرنے لگتا۔ ہاں نہیں تو جیسے مجھے ابا جی نے پکا کر دیا تھا اور مس ہارورڈ کی باتوں کا دل پر اثر ہی نہیں ہوتا تھا ایسا ہی پتھر دل اس کا ہے اور پھر ہارے ہوئے دل سے جواب دیتی۔

''اچھا مت رکھنا۔ لیکن بھئی شراب مت پینا۔''

''وہ کیوں؟''

''مجھے شرابیوں سے ڈر لگتا ہے۔''

''میں اب شراب ہی تو پیے بیٹھا ہوں۔''

''اب کی بات اور ہے۔''

اور اس کو اچھی طرح احساس ہو گیا کہ یہ لڑکی کٹ حجت اور بے مغز ہے۔

''اچھا بھئی تو چلو کر لو مسلمان۔ کل چلو اور ایسا بھی مبلغ کبھی کا ہے کو کسی کے پلے پڑا ہو گا جو محض اپنی بے مغزی سے دوسرے کا مذہب بدلوا دے۔''

اور دوسرے دن وہ مسلمان ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔ اب یہ تو وہی جانے وہ سسرال گیا یا نہیں اس سے مطلب نہیں۔ سسرال کی گلی وہ جیت لایا تھا۔ اس گلی میں کھیل کر بڑی ہونے والی اس کی منکوحہ کی حیثیت سے اس کے ساتھ سوئٹزرلینڈ کے مرغزاروں کی طرف پرواز کر رہی تھی۔

اس کے سسرالیے کون ہیں اور کس حسب ونسب سے تعلق رکھتے ہیں' اس سب سے بے نیاز وہ غافل سویا ہوا تھا۔

جہاں آرا فیلڈن نے جھک کر دیکھا' یہ سرزمین جس کی فضاؤں میں اب طیارہ پرواز کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اس کی یادوں اور ماضی کی سرزمین پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ بابل کا دیس چھوڑ آئی تھی۔

اس کے ہاتھوں میں کس نے مہندی لگائی نہ شہانی چوڑیاں چڑھائی تھیں۔ اس کا باپ ایجاب وقبول کے مرحلوں کے وقت اس کو سہارا دینے موجود تھا نہ اس کو ڈولے میں سوار کرنے ڈیوڑھی تک آیا تھا۔ پھر دور اندھیری گلی میں ایک بند دروازہ نظر آ رہا تھا۔

''بابل تم اپنے دروازے ہمیشہ کھلے رکھنا۔''

اس نے جاتے جاتے مڑ کر خاموش صدا دی۔

بند دروازے کو عبور کرتی ہوئی ایک کم زور اور شرمسار آواز اس کے کانوں میں تھرتھرائی صاحب قاب قوسین محبوب رب المشرقین جد الحسن والحسین۔

اس آواز میں اب وہ اگلا سا پندار نہ تھا۔ کیا حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جد سے بھی میرا ناتا ٹوٹ گیا۔

جہاں آرا فیلڈن کی آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے پھوٹ پڑے جواب جہاں آرا سید نہ تھی۔

گھوں گھوں گھر گھر کی غیر مانوس آوازوں سے ایئر ہوسٹس کا ذہن بخوبی واقف تھا۔۔۔۔۔۔۔ چنانچہ بھوری آنکھوں اور معصوم چہرے والی کم سن ایئر ہوسٹس نے بے بسی سے سوچا۔تو کیا میری مانگ میں افشاں کے تارے کبھی نہ جھلملائیں گے؟اور جہاں آرا نے گھبرا کر فیلڈن کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ مجھے تمہاری تمنا تھی۔ مجھے تمہاری ضرورت تھی اور مجھے تم سے محبت ہے۔اس کے جھکے ہوئے سر کی مانگ میں اس کے سہاگ کی واحد نشانی افشاں کے تار جھلملا رہے تھے۔

بالکل وہی سراپا اور وہی اس کے اپنے خدوخال۔ پھر انسان کی روح بلندیوں کی طرف پرواز کرتی ہے' تو وہ کتنا بدل جاتا ہے' فیلڈن نے ڈوبتے ہوئے دل سے سوچا۔

اور واقعی جہاں آرا کے چہرے پر لطف وسرور کی عجب کیفیت طاری تھی جیسے کسی نے اس کو یقین دلا دیا ہو کہ تمہارے پاؤں اب پستیوں سے کبھی مس نہ ہوں گے جیسے اس کو اس کی خواہش کے مطابق شہ پر مل گئے ہوں۔

◆◆◆

پرانا حریف

کھانے کی میز پر جگ الٹ جانے کی وجہ سے پانی پھیل رہا تھا اور پلاسٹک کی باریک پھول دار چادر پر سے بہہ کر کرسیوں کے بید میں جذب ہو رہا تھا۔ نمک دانی میں نمک بے تحاشا بھرا ہوا تھا اور سیاہ مرچ کی شیشی بالکل اوندھی پڑی تھی۔ جالی کے دروازے چوپٹ کھلے پڑے تھے اور مکھیاں بے تکلفی سے آ جا رہی تھیں۔ پینٹری اور باورچی خانے سے آنے والی ہوا میں ابھی تک کئی مصالحے کے سالن' کھڑی مسور کی دال اور خشکے کے علاوہ دسہری آموں کی خوشبو بسی ہوئی تھی اور برتنوں کے دھلنے کی آواز آ رہی تھی۔ درمیانے بچوں میں سے کوئی سی دو لڑکیاں سائیڈ بورڈ کے قریب گتھم گتھا ہو رہی تھیں اور پورسلین کا فروٹ بول سخت خطرے میں تھا۔ ان دونوں سے دونوں چھوٹے لڑکے پردے کی آڑ سے ان گھونسے دکھا رہے تھے۔ اس سب کے باوجود گھر پر ایک افسردہ سی خاموشی تھی۔

''سارا گھر نیچے اوپر رہتا ہے اور اب تو یہ عورت آنکھ اٹھا کر کسی چیز کو نہیں دیکھتی۔'' وہ الجھے۔

''کیا واہیات پن ہے' کیوں کتیوں کی طرح لڑے چلی جا رہی ہو؟'' رانا صاحب نے جھنجھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

ابو جی اس وقت یقیناً غصے میں تھے۔ جب ہی تو انہوں نے کتیوں کا لفظ استعمال کیا اور جو ان کا مزاج عام حالت پر ہوتا' تو وہ کہتے کیوں بلیوں کی طرح لڑے چلی جا رہی ہو۔ زرینہ نے گھوم کر ابو جی کی طرف دیکھا' ان کی کھلی کھلی آنکھوں میں کھویا پن اور سرخ سرخ ڈورے بے خوابی کا پتا دے رہے تھے۔

''پتا نہیں یہ ابو جی اب اتنے گم سم کیوں رہا کرتے ہیں۔'' زرینہ نے سوچا۔

''ادھر آؤ قدسیہ۔'' انہوں نے اس کو غلط نام سے پکارا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا' حالانکہ قدسیہ تو ان کی آواز سنتے ہی پینٹری کے راستے فرار ہو چکی تھی۔ سر میہوڑائے وہ ان کے قریب آ کھڑی ہوئی اور سوچنے لگی' اب تو کچھ دن سے ان کو اپنے بچوں کے نام یاد نہیں رہے' عجیب ہو گئے ہیں۔

''یہ تم کیا ہر وقت اودھم مچائے رکھتی ہو؟ اسکول کیا بند ہوتے ہیں ہمارے سر سے قیامت گزر جاتی ہے۔ آخر تمہاری امی تم کو دفع کیوں نہیں کر دیتیں چھٹیوں میں' نفرت ہو گئی تم سب کی صورتوں سے۔''

ان کے آخری فقرے میں اس درجہ صداقت تھی کہ اس سے متاثر ہو کر زرینہ نے اپنی کلائی مروڑ کر ان کی گرفت سے آزاد کر لی۔

اور وہ ہاتھ جب ان کی گرفت سے آزاد ہو گیا' تو رانا صاحب نے محسوس کیا کہ اس ہاتھ سے بھی اب کم سنی کی ناتوانی اور دبلا پن رخصت ہو رہا تھا۔ یہ کلائی اب گداز ہوتی جا رہی تھی اور اس کے اندر ایک خوابیدہ سی قوت انگڑائی لے رہی تھی۔ جبھی تو گیارہ سال کی اس لڑکی نے اس آسانی سے کلائی مروڑ کر ان کی گرفت سے آزاد کر لی تھی۔ اس لڑکی آنکھوں میں حریفانہ چمک تھی۔

تو گویا ایک اور لڑکی بڑی ہوئی۔ کم بخت بچے آندھی پانی کی طرح بڑھ رہے ہیں۔ ان کو بڑھتے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ ہم پیچھے رہے جا رہے ہیں اور وقت آگے نکل گیا۔

''کدھر ہیں تمہاری امی؟''

زرینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے کھڑی سوچتی رہی' انھیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ اپنے کمرے ہی میں ہوں گی۔ ''چلو جا کر لیٹو اپنے کمرے میں' اگر ایک دوسرے سے تم لوگ لڑے تو پھر آج سب کو ٹھیک کروں گا'' اور وہ آگے بڑھ گئے۔

پیچھے سے تو ابو جی بالکل لڑکے جیسے لگتے ہیں بالکل یاد نہیں رہتا کہ ابو جی ہوں۔۔۔۔۔۔۔ کتنے اسمارٹ ہیں میرے ابو جی۔

زرینہ نے نفرت والے فقرے کے ذہن میں تازہ ہونے کے باوجود پیار سے سوچا۔

اور اب اگر میں بچوں والے کمرے میں گئی' تو قدسیہ پھر مجھ سے جھگڑا کرے گی۔ پپو اور گڈو اس کا ساتھ دیں گے۔ پنجوں کے بل چلتی ہوئی وہ امی کے برابر والے چھوٹے کمرے کے فرش پر جا کر اوندھی لیٹ گئی۔

ان کی بھاری سے جسم والی بیوی مسہری پر بیٹھی ٹیپو کا نیکپن بدل رہی تھیں۔

''ٹیپو تو اب تمھارا نواسہ لگتا ہے۔'' رانا سعید نے ٹائی اتار کر مسہری کے ہتھے پر ڈال دی۔

''اور آپ کا تو جیسے بھائی لگتا ہے۔'' انہوں نے نیکپن کے تینوں سرے ملا کر پن لگا دی۔

''خیر بھائی نہ سہی' اولاد تو لگتا ہے۔'' ان کی ہنسی میں طنز تھا۔

غوں' غوں اوں آں' ٹیپو شاید پن چبھ جانے پر کسمایا۔

اور امی نے اتنی سی بات پر ایک دھپ موٹے تازے گلگوتھنا سے بچے کے لگائی اور ٹیپو بلک کر رو دیا۔

زرینہ نے چونک کر درمیانی پردے کے نیچے سے جھانکا۔

ابو جی کرتے پاجامے میں پہلے سے بھی اچھے لگ رہے تھے۔

''مجھے وہ عورتیں سخت بری لگتی ہیں جو اپنا غصہ بچوں پر اتارتی ہیں۔ ان کی آواز میں سکون کے باوجود جھنجھلاہٹ کا خفیف سا تاثر

تھا۔

''وہ عورتیں کیوں' میری تمام باتیں آپ کو بری لگنے لگی ہیں۔'' امی کی آواز عام بول چال میں بھی بلند تھی۔ وہ اپنے رلائے ہوئے بچے کو اب خود ہی چپ کرا رہی تھیں۔

''شائستہ' میں نے تم سے بارہا کہا ہے کہ ذرا ذرا بات پر فیل نہ مچایا کرو۔ نا معلوم تم شائستگی سے اتنی دور کیوں ہو۔''

''بھاڑ میں گئی تہذیب اور شائستگی۔ اس کم بخت کے مارے انسان اپنے دلی جذبات کا اظہار بھی نہ کرے۔'' اب ان کی آواز اور بھی پھٹ چکی تھی۔ ''اچھا خاموش رہو مجھے سونے دو۔'' ابو جی کی آواز میں سچ مچ کا جھگڑا تھا۔

زرینہ اب یہ سوچ رہی تھی کہ مجھے تو دھمکا رہے تھے اگر تم لوگ لڑے تو سب کو ٹھیک کروں گا۔ اور خود کمرے میں گھستے ہی لڑائی نکال کر بیٹھ گئے۔ بالکل جیسے ککو کرتا ہے۔

''اب پھر تم نے یہ ساری پہن لی۔ کتنی بار کہا ہے اتنی موٹی ساریاں نازک اندام عورتوں پر سجتی ہیں اور موٹی عورتیں تو۔۔۔۔۔۔'' پوری بات سنے بغیر بیگم شائستہ رانا ایک بار پھر بڑے سکون سے ڈریسنگ روم میں واپس چلی گئیں۔ تیز نارنجی رنگ کی سلک کی ساری اتار کر گھوڑی پر ڈالی اور اب یہ بلاوز بھی بدلوں۔ انہوں نے بلاؤز کو غور سے دیکھا۔ سفید زمین اور نیلے پھولوں والی نائلون کی ساری کی مناسبت سے لپ اسٹک کا شیڈ بدلا اور پورے اہتمام سے تیار ہوئیں۔ اپنے سفید نفیس بلاؤز کی مناسبت بھی ہلکی اور لطیف خوشبو کا لگایا۔ ایک بار پھر وہ آئینے کے مقابل آئیں پوڈر اور روج کی دبیز تہ کے نیچے دبی ہوئی چہرے کی جھائیاں اب اتنے جارحانہ انداز میں دھمکیاں نہ دے رہی تھیں۔ کجلائی ہوئی آنکھوں میں جاتی ہوئی جوانی کے قدم ٹھٹکے نظر آ رہے تھے۔ اس مرتبہ وہ پورے اعتماد سے باہر نکل کر آئی تھیں۔

رانا سعید نے اپنے شارک اسکن کے کوٹ کا کالر درست کرتے ہوئے اس بار پھر ان کی شخصیت کو مسترد کر دیا۔

''میں کہتا ہوں تم کو اتنی خبر نہیں کہ یہ گلاس نائلون تمہارے جیسے بھاری جسموں پر پھول جاتی ہے بالکل غبارہ۔''

بڑی مشکل سے تھامے ہوئے صبر کی باگیں ان کے ہاتھوں سے چھوٹ پڑیں۔

''تو کیا مطلب ہے آپ کا۔۔۔۔۔۔۔ اب کیا ننگی چلی جاؤں اس لیے کہ میرے جسم کو اب کوئی کپڑا بھی آپ کی ہمراہی کے شایان شان نہیں بنا سکتا۔'' وہ پست ہو کر کرسی پر بیٹھ گئیں۔

''جلدی کرو' ہم ہمیشہ دیر سے پہنچتے ہیں۔ امریکی مہمانوں سے شرمندگی ہوتی ہے۔''

''میں کہتی ہوں آپ اکیلے ہو آیئے۔ چھوڑیے مجھے۔''

''بچوں کی سی باتیں نہ کرو۔'' وہ بڑے مہذب انداز میں جھنجھلائے۔ یہ بھی تو آداب محفل کے خلاف تھا کہ بیاہا بیوی والا مرد بیوی کو تو سینت آئے اور خود دوسروں کی بیویوں' بیٹیوں سے ہنستا بولتا پھرے۔

''پھر میں کیا کروں؟ میں اپنے آپ کو کس طرح سے بدل لوں۔'' اس کی آواز میں بے بسی اور آنسوؤں کی نمی تھی۔

''شائستہ تم کوشش کیوں نہیں کرتیں؟ اور لوگوں کی بیویوں کو دیکھو' کیسی اسمارٹ نظر آتی ہیں۔''

''آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ میں نو بچوں کی ماں ہوں جن میں سے تین تقریباً جوان ہیں۔''

''میں بھی تو ان ہی نو بچوں کا باپ ہوں۔'' رانا کی آنکھوں میں فخر تھا۔

انہوں نے نظر بھر کر دیکھا' واقعی نو بچوں کا یہ باپ تو روز بروز کچھ اور خوبصورت ہوتا جا رہا تھا۔ خوبصورت' روشن اور شگفتہ چہرے کو تجربے اور خود اعتمادی نے اور بھی دل کش بنا دیا تھا۔ بے شمار وہم اور وسوسے ان کے دل میں سر اٹھا رہے تھے۔ کتنے ہی لوگ ان کو بن بیاہا سمجھتے تھے اور جو نہیں بھی سمجھتے تھے وہ بھی اس حقیقت کو نظر انداز کرنے میں حرج نہ سمجھتے تھے۔

میک اپ کے سامان سے لدی ہوئی قیمتی سنگھار میز کے قریب اسٹول پر بیٹھ کر انہوں نے پیرس اور امریکا کے درآمدہ سامان کو بڑی حسرت سے دیکھا جو مل جل کر ان کے شوہر کے سامنے ان کی سفارش سے قاصر تھا۔

بے نام آنسوؤں کی ایک رو ابلنے سے پہلے ہی خشک ہو گئی۔ سیاہ جارجٹ نائیلون کی ساری اور سیاہ بلاؤز انہوں نے اس انداز سے پہنا جیسے وہ کسی احتجاجی جلوس کی شرکت کے لیے تیار ہو رہی ہوں۔

سیاہ رنگ کی مناسبت سے میک اپ بھی نئے سرے سے کرنا تھا۔ لپ اسٹک کا شیڈ بدلتے بدلتے انہوں نے سرد آہ بھری۔

اے کاش! میری الماریاں قیمتی ساریوں سے اور میز سنگھار کے سامان سے بھری نہ ہوتی۔ اللہ میرے! کسی بڑے اونچے آدمی کی بیوی ہونا بھی اعمال کی سزا سے کم نہیں۔

اور پھر اس مرتبہ وہ باہر نکلیں' تو ان کے قدم ہر مرتبہ سے زیادہ لڑکھڑائے ہوئے تھے۔ چہرے پر مایوسی اور سراسیمگی تھی۔ وہ اتنی نروس ہو رہی تھیں کہ گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے تین چار تو بچے ان کے ہاتھ سے پٹے اور بیرے پر اتنے زور سے چلائیں کہ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

''عورت جب بدمزاجی پر اترتی ہے' تو وہ اس کے سب سے گھناؤنا اور خوف ناک روپ ہوتا ہے۔'' رانا نے اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھ

کر کہا۔ اگر وہ ان کا اپنا پہلا سا رانا ہوتا' تو وہ پھٹ سے پوچھتیں'' کیا عورت مٹی کی بے جان مورت بنی رہے اور فطری پن اس کے پاس بھی نہ پھٹکے۔ آخر عورت کے لیے یہ کیوں ضروری ہے کہ وہ پھول کی طرح کھلی ہوئی نفیس نازک نظر آئے۔'' مگر اب یہ رانا سعید' جو اسٹیرنگ وہیل پر ہاتھ جمائے ان کے بازو میں بیٹھا تھا ان کا اپنا رانا کب تھا۔ ان کے قبضے میں تو اس کا خالی اور بچھرا ہوا پیکر اور اس کی دولت رہ گئی تھی اور وہ ہنستی گاتی روح اور حساس دل تو نہ جانے کہاں کھویا گیا تھا۔

اور یہاں پر تم ہو کہ جیسے رات کی اس تقریب میں صبح بہار بھولے اتر آئی ہو۔ رانا نے موٹر کو لاک کرتے کرتے لان پر بیٹھے مہمانوں کے جھرمٹ میں اسے بیٹھے دیکھ کر سوچا۔ وہ بے حد ہلکی پیازی رنگ کی پلین ساری اور اسی کے ہم رنگ بلاؤز میں بالکل سادہ طور پر بال بنائے بغیر کسی میک اپ کے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ ارے تم ہر سنگھار اور زیبائش سے بے نیاز ہو۔ کام اور مصرفیت کی بنا پر تمہاری تھکی تھکی نظریں' ہر تبسم پر دمک جانے والے شفاف دانت اور لاجونتی کا سا نازک سراپا اور ڈاکٹر ہاجرہ جو تم نہ ہوا کرتیں تو کیسا لگا کرتا۔ رانا کے نپے تلے قدم بڑی دل کشی سے آگے بڑھے اور اس کی آنکھیں نوعمری کے انداز میں مسکرائیں۔

''مسز رانا کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔'' مسز جمشید نے انصاف اور سادگی سے ریمارک پاس کیا۔

اور صفت یہ ہے کہ نو بچوں کی ماں ہیں۔ اب تک ان میں زیبائش اور رعنائی ہے۔ پائلٹ آفیسر شوکت کی بات سن کر شائستہ رانا نے افسردگی سے سوچا' مگر رانا کو یہ کوئی کیوں نہیں بتاتا۔

جانے پہچانے لوگوں کو دیکھ کر ڈاکٹر ہاجرہ مڑی اور خوش دلی سے مسکرائی ''ہیلو! کہتے میرا بیٹا ٹیپو کیسا ہے؟'' سوال وہ مسز رانا سے کر رہی تھی اور نگاہیں اس کی رانا کے کوٹ کے کالر میں لگی ہوئی زرد گلاب کی نیم شگفتہ کلی میں الجھی ہوئی تھیں جو آخر میں ہمیشہ اس کو مل جایا کرتی تھی۔

''ہیلو! اچھا ہے ادھر کچھ دنوں سے دودھ کم پیتا ہے اور اس کا تالو کچھ گرم رہتا ہے۔'' انہوں نے فکر مندی سے بجھتے لہجے میں جواب دیا۔

جواباً اس نے اپنے خوبصورت دانت چمکا دیے۔ ''ارے مسز رانا نو بچے پال کر بھی آپ اتنی سی بات سے فکر مند ہیں' ٹیپو دانت نکال رہا ہے۔ کل میں آ کر اس کو دیکھ جاؤں گی۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' رانا نے تائید کر دی۔''

کھانے کے بعد کچھ دیر ریکارڈنگ ہوئی اور پھر میزبان ڈاکٹر فیلڈن نے وہ فلم دکھائی جو انہوں نے جاپان میں تیار کی تھی۔

دھان کے کھیت' ٹوکیو کی سڑکیں' کاغذی مکان' باغات' پکوڑے' چیری اور ناشپاتی کے شگوفے اور گیشائیں۔ قوس قزح کے سے رنگ بکھیرتے پردے پر سرکتے رہے۔ رانا' ہاجرہ اور شائستہ کے درمیان بیٹھے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے رہے۔ ہاجرہ بچوں کی طرح چہک چہک کر فلم پر کمنٹری کرتی رہی اور بیگم شائستہ رانا بڑی افسردہ دلی سے سوچتی رہیں۔ ڈاکٹر ہاجرہ میری اور تمہاری تھی۔ یہ ٹیپو تھا جو تمہیں رانا سے قریب لے آیا۔ وہ اس کی پیدائش پر کتنا خوش تھے۔ اگر کبھی میں کہتی بھی تھی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ شاہباز کو اب اٹھارواں سال ہے' بلکہ دیکھنے میں تو وہ اکیس سال کا لگتا ہے اور غوثیہ گئے نومبر میں پندرہ کی ہوئی' تو فوراً بگڑ جاتے تھے۔

''واہ جی کہنے دو ہماری اولاد ہے۔ خدا نے ہمیں دیا ہے اپنی اولاد ہے۔ خدا نے ہمیں دیا ہے اپنی اولاد پر ہم خرچ کر سکتے ہیں تو کیوں نہ پیدا کریں۔''

اور پھر شائستہ رانا کو وہ تمام خاطر داریاں اور اہتمام یاد آ گئے جو رانا نے ان دنوں کی تھیں۔

تمام رات کے بے خواب انتظار کے بعد جب ڈاکٹر ہاجرہ نے برآمدے میں ان کے پاس جا کر اپنے مخصوص مسکراتے ہوئے انداز میں بیٹا ہونے کی خوش خبری سنائی تھی' تو وہ اس کو نظر انداز کر کے' بغیر شکریے کا ایک لفظ کہے کمرے کی طرف لپکے لیے تھے۔

اور اس دن کی بات بھی مجھے خوب یاد ہے جب انہوں نے پردہ سیمیں پر ایک بہت رومانٹک سے پل پر سے ایک گیشا کو گزرتے دیکھ کر سوچا تھا۔

میرے قریب کرسی پر بیٹھ کر رانا نے پہلی بات یہ کہی تھی: ''ارے شائستہ! تمہارے چہرے پر جھائیاں پڑ گئیں ہیں۔'' اور کچھ دیر تک باتیں کر چکے اور جب وہ خدا حافظ کہنے کو جھکے تو چونک کر بولے: ارے شائستہ! تمہارے بال تو خاصے سفید ہو گئے۔ سب سے چھوٹا ٹیپو تو بڑے بڑے انکشاف ساتھ لایا۔ میں نے تکیے پر سر رکھ کر سوچا تھا اور اسی آن میری نظر تم پر پڑی تھی۔ ہاجرہ! لچکتا ہوا خوبصورت قد' گداز کلائیاں' نشیلی آنکھیں اور مسکراتے ہوئے لب' کبھی میں بھی ایسی ہوا کرتی تھی' بلکہ میرا رنگ کتنا شفاف تھا۔ لیکن خدا کو مان کر یقین کرنا ہاجرہ کہ میرا دل تم سے قطعی صاف تھا۔۔۔۔۔۔۔ اب اس محفل سے ان کو بیزاری ہو رہی تھی۔ ٹیپو ضرور رجھوکا ہو گا۔ ہر ماں کی طرح ان کو پتا چل گیا' لیکن وہ رانا کو چلنے پر مجبور تو نہیں کر سکتی تھیں۔ پھر ہاجرہ کو بھی تو اس کے گھر چھوڑنا ہے۔

اکیس' بائیس' تیئیس۔ اوپر سے نیچے آتے وقت ہر بار گنتی بڑھ رہی تھی اور ان کی سانس کا توازن بگڑ رہا تھا۔ پسینا ان کے انگ انگ سے پھوٹ رہا تھا۔ ہار کر وہ کرسی پر بیٹھ گئیں اور جو میں اتنا ریاض اپنی روح کی بالیدگی کی خاطر کر لیتی' تو کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔ گھومتے ہوئے سر سے آنکھیں بند کیے کیے انہوں نے سوچا۔

''میری بچاری امی'' زرینہ نے کڑھ کر سوچا اور ان کے پسینے میں ڈوبے ہوئے سرد ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ انہوں نے جیسے اپنے سارے ہتھیار کھول کر ڈال دیے۔

ناشتے کی میز پر لیموں کے نمکین رس کا گلاس اور بھوسی کے نمکین بسکٹ دیکھ کر بچپن میں سنی ہوئی سات بیٹیوں کی کہانی والی بندریا کا خیال آ گیا جس کے گھر کی کوٹھری لٹھرے نعمتوں سے بھرے ہوئے تھے' مگر اس کے نصیب میں فقط چونی بھوسی کی ایک ٹکیہ تھی۔

اور جو میں اس بڑے انجینئر کے بجائے کسی مزدور سے بیاہی جاتی' تو فرق کیا پڑتا۔ روکھی سوکھی کھا کر اس مشقت اور ریاض کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ بیگم شائستہ رانا کی آنکھوں کے کونوں میں نمی اور تراوت تھی اور اب بھی تو میں رانا کو مطمئن نہیں کر پا رہی ہوں۔ نہیں میں رانا کو کبھی مطمئن نہیں کر پاؤں گی۔ انہوں نے نیبو کے نمکین رس کا ٹھنڈا گلاس پکڑے پکڑے میز کے کونے پر سرٹیک دیا۔ بجلی کا پنکھا مستعدی سے چل رہا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشوں کے اس طرف باہر گرم اور توانا دھوپ پھیلتی اور بڑھتی جا رہی تھی۔ گزرے ہوئے وقت کے سارے پر مشقت لمحوں اور کوششوں نے حسرت سے آنکھیں جھپکا کر دیکھا کہ شائستہ رانا نے ہتھیار ڈال دیے۔

''میری طبیعت اچھی نہیں ہے آپ غوثیہ کو ساتھ لے جایئے۔'' وہ اب کسی پارٹی یا ڈنر میں جانے کے خیال سے سہم جاتی تھیں۔

اور غوثیہ کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنی بڑی پارٹی میں امی کی قائم مقام بن کر جائے گی۔ خوشی اور گھبراہٹ کے مارے اس کو اپنا کوئی سا جوڑا بھی پارٹی کے قابل نظر نہ آ رہا تھا۔

''تم میری ساری پہن لو جانی۔'' ماں نے بڑے پیار سے کہا تھا۔

''سچی! امی جی۔'' غوثیہ کو معلوم تھا کہ امی جی کو اپنی قیمتی ساریاں بہت پیاری تھیں اور یہ بات اس کو ناقابل یقین معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اپنی ماں سے لپٹ گئی۔

امی جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے اتنی توجہ اور پیار سے غوثیہ کو اپنے ہاتھوں سے بنایا سنوارا تھا کہ غوثیہ کو پریشانی سی ہونے لگی تھی اور آئینہ تو اس وقت اس سے بڑی بڑی باتیں کہہ رہا تھا' لیکن اس کو یقین اس وقت آیا جب امی جی نے اس کو سر سے پیر تک تنقیدی نظر سے دیکھنے کے بعد اس کا ماتھا چوم لیا تھا۔ اور لے ایلاف پڑھ کر اس پر دم کر دی۔

غوثیہ کو اپنے خوبصورت باپ کی ہمراہی میں جاتا دیکھ کر بیگم شائستہ رانا کا کھویا ہوا اعتماد اچانک ہی واپس آ گیا تھا۔ وہ بے فکری سے بیٹھی اپنے ٹیپو کو دودھ پلاتی رہیں۔

اور اس شام ہاجرہ پارٹی میں غوثیہ کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ پندرہ سال کی یہ دبلی پتلی سی لڑکی اس وقت کتنی دل نواز نظر آ رہی تھی۔

اس نے محبت سے اس کی طرف دیکھ کر رانا سے تقریباً سرگوشی میں کہا تھا: ''اپنی غوثی کتنی گریس فل نظر آ رہی ہے!''

''ہاں۔'' رانا نے افسردگی سے اور بجھی ہوئی آواز میں ہاجرہ کو بتایا! ''بالکل اپنی ماں کی تصویر ہے۔''

ہاجرہ مڑ کر جارج فیلڈن سے گزشتہ پارٹی والی جاپانی فلم پر تبادلہ خیال کرنے لگی تھی۔

رانا نے ایک نظر غوثی کو دیکھا اور سوچا مجھے سب معلوم ہے۔ آہستہ آہستہ تمھاری ماں اپنے حقوق سے دست بردار ہو رہی ہے اور اب اس نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ میں سب سمجھتا ہوں' شائستہ تمھارے ایکسر سائز چھوڑنے نہ چھوڑنے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ یہ تو تمھاری کوشش تھیں جو تم نے کر دیکھیں۔ اب میں تم کو کیا بتاؤں کہ تم مجھے کتنی اجنبی اور بیگانہ محسوس ہوتی ہو جیسے ایک ہی ڈبے میں لمبا سفر کرنے والے دو اجنبی مسافر' اور تم سمجھتی ہو کہ میں چین سے ہوں۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ وقت کے حادثات لمحات کے ایک چھوٹے سے لمحے نے مجھے کس کشمکش میں مبتلا کر دیا۔

ادھر رانا سعید کو بہت جلدی جلدی ایبٹ آباد کے کام نکل رہے تھے۔ یہ اور بھی اتفاق تھا کہ ہاجرہ کا کنبہ ان دنوں وہاں چھٹیاں منا رہا تھا۔

مگر وہ ان سب اتفاقات سے بے نیاز ہو چکی تھیں۔ ان کے چہرے پر جو الجھن اور ہراسانی رہتی تھیں' اب اس کو کھلے آنگن میں چھوڑ کر بے پرواہ ہو گئی تھیں۔ وہ زیادہ تر باہر رہنے لگے تھے۔ اور وہ بچوں سے بہت قریب آ گئی تھیں۔ اب تو جب بچے دن کے وقت ان سے کہانی سنانے کی ضد کرتے' تو ان کو یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش نہ کرتیں کہ دن کے وقت ان سے کہانی سنانے کی ضد کرتے' تو ان کو یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش نہ کرتیں کہ دن کو کہانی سنو گے تو ابو جی راستہ بھول جائیں گے جو جان بوجھ کر راستہ بھلانے کی کوشش میں ہو اس کی راہ کون کھوٹی کرے۔ اور دوپہروں کو بڑے آرام سے لیٹ کر ان کی لمبی لمبی کہانیاں سناتیں۔

ارے یہ امی تو بڑی بے ضرر سی چیز ہیں۔ اب نہ گھر الٹنے پر ڈانٹتی ہیں اور نہ شور مچانے پر۔ امی تو ابو جی کی زبردستی سے بنی سنوری رہتی ہیں۔ زرینہ نے سوچا جو بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ ساری گڑبڑ وہی مچاتے ہیں۔ اسمارٹ ہیں تو کیا کریں۔ گھر رہتے ہیں تو امی بچاری کو کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہیں دیتے۔ بس ہر وقت اچھے اچھے کپڑے پہنے کسی بندھی لپ اسٹک پہنے جوڑے باندھے یوں تیار بیٹھی رہتی ہیں جیسے مہمان آئی ہوں یا بر ہر جا رہی ہوں اور امی ایسے میں کیسی غیر سی لگتی ہیں۔ زرینہ کو نچی کھسی حالت میں گھومنے کا خود بھی شوق تھا اور دوسروں کو بھی ایسے اجاڑ حلیوں میں دیکھ کر تسکین ہوتی تھی۔

''دیکھو غوثی' میری مانو کہ ابو جی کو ڈاکٹر ہاجرہ سے ایل او وی ای ہو گیا ہے۔'' شہباز نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''چلو ہٹو بھی بھائی جان۔''غوشیہ بوکھلائی کیونکہ مشکوک تو کچھ دن سے وہ بھی رہنے لگی تھی۔

''ہٹوں کدھر؟ واہ بھئی پیچھے تو کھڑکی ہے۔''

''میرا مطلب ہے کہ ایسا بھی کیا ہے۔اتنے بچوں کے باپ سے بھلا۔ڈاکٹر ہاجرہ اتنی تو ینگ لگتی ہیں۔لڑکیاں لڑکوں کی طرح بے دھڑک کب ہوتی ہیں۔''ڈاکٹر ہاجرہ اتنی تو ینگ لگتی ہیں۔لڑکیاں لڑکوں کی طرح بے دھڑک کب ہوتی ہیں۔''

غوشیہ مارے بوکھلاہٹ کے بات بھی پوری نہ کر پاتی۔

''جناب میرا باپ ان سے ہزار درجہ اسمارٹ ہے۔مجھے تو رشک آتا ہے بڑے میاں پر۔میرے بچپن میں وہ اتنے خوبصورت نہیں ہوا کرتے تھے۔''

''امی کی ہماری شکل پہلے سے بہت مٹ گئی ہے۔''

''وہ تو مٹنا تھی۔''شہباز نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''پر میں تو یہ کہتا ہوں کہ میری مانیں تو ڈاکٹر ہاجرہ کو میرے نام ٹرانسفر کر دیں۔''

''اے ہٹیے۔''غوشیہ پھر بوکھلائی۔''پتا ہے وہ دیکھنے میں اتنی اسمارٹ لگتی ہیں۔ہماری امی سے چار پانچ سال کم ہے عمران کی۔وہ اتنی عمر رسیدہ بھاوج آنے کے خیال سے لرز گئی۔''ابو جی کا تو پھر بھی جوڑ ہے۔''

''تو کیا ہوا امی کی شادی چودہ سال کی عمر ہی میں تو ہوئی تھی۔کل پندرہ سال تو والدہ صاحبہ مجھ سے بڑی ہیں۔اس سے زیادہ تو میں ٹیپو سے بڑا ہوں۔''شہباز ہنسا۔

''اچھا ہے بلا سے ابو جی کو ڈاکٹر ہاجرہ لے جائیں۔''زرینہ نے خود غرضی سے سوچا۔''آرام سے ان کے چاروں طرف لیٹ کر بات کرنے اور کہانیاں سننے کا تو موقع ملے گا۔اور جوان ابو جی کے چکر میں رہیں تو بس جوڑے بنا رہی ہیں' نیل پالش روز روز بدل رہی ہیں' کرسیوں پر کھونٹا سی چڑھی بیٹھی ہیں۔اور اب آج کل کیسے نیم کے درخت کے نیچے کھڑی چارپائی پر لیٹ کر مائی سے سر میں تیل ڈالواتی اور پیروں کی انگلیاں چٹخواتی ہیں۔اس دن کہہ رہی تھیں۔مائی ان اونچی اونچی ایڑیوں کے جوتوں نے تو میری پنڈیوں میں مستقل درد کر دیا ہے۔وہ ایڑیاں بھی کب ہیں میخیں ہیں۔

''اب تو یہ بچے میرا نوٹس ہی نہیں لیتے۔آؤں یا چلا جاؤں کسی کو فکر نہیں' ایک حد فاضل ہو کر رہ گیا ہوں۔''رانا ہر بار جب گھر میں آتے کڑھ کر سوچتے۔''میرا گھر میرے لیے بیگانہ ہو گیا۔ضرور اس میں شائستہ کی کوئی سازش ہے۔''ان کا دل بچوں کی ماں کی طرف

سے اور بھی مکدر ہو جاتا۔

زرینہ کھڑی شپڑ شپڑ نیبو کا شربت گھول گھول کر پی رہی تھی۔ فرج کے پاس پانی ہی پانی بہ رہا تھا اور میز پر شربت کا شیرہ جا بجا ٹپک جانے سے مکھیاں بھن بھن کر رہی تھیں۔

''کیوں رشیدہ' یہ تم نیبو کا شربت بنا بنا کر پی رہی ہو۔ اور گلے کا یہ حال ہے کہ رات بھر کھانستی ہو۔ ذرا دیکھو تو اپنا پھوہڑ پن ایک گلاس شربت بنایا ہے اور دو جگ پانی بہایا ہے۔ کیا کچر کچر مچا رکھی ہے ماں تو تمہاری کسی وقت آنکھ اٹھا کر دیکھتیں نہیں۔ چلو کسی کو بلا کر زمین خشک کرواؤ۔ آج شام کو تیار ہو جانا میں تم کو ہاجرہ کو دکھا کر لاؤں۔'' زرینہ بھنا گئی۔ وہ تو اس کے پرانے حریف تھے۔

ماں کو نام تو یاد رہتے ہیں' یہ تو نہیں کہ زرینہ کو رشیدہ اور رشیدہ کو نوشابہ کہہ دیں۔ کیا کر لیں گی ڈاکٹر ہاجرہ۔ امی نے جو مجھے جوشاندہ پلاتا ہے۔ اس نے مروڑ کر کلائی ان کی گرفت سے آزاد کر لی۔

اور برآمدے میں امی نماز پڑھ رہی تھیں سر پر دوہرا دوپٹہ لیے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے التحیات پڑھتی ہوئی اس عورت کے دھلے دھلے چہرے پر سکون اور طمانیت تھی۔۔۔۔۔ ''ہاں تم پر سکون نہیں ہو گی تو کون ہو گا' تم نے میری ساری اولاد کی تربیت جو چھین رکھی ہے۔'' ان کو بلاوجہ ہی غصہ آ گیا۔ اس وقت وہ خود کو بہت تنہا اور بے سہارا محسوس کر رہے تھے۔ ٹھیک ہے کر لو میرے خلاف خوب سازش۔ میں نے بھی اس وقت فیصلہ کر لیا ہے کہ ہاجرہ نے جس ضروری گفتگو کے لیے آج مجھے بلایا ہے' ضرور جلاؤں گا۔

اور اب یہ آ کر مجھ سے گاڑی کا مطالبہ کرے گا۔ انہوں نے شہباز کو دیکھ کر سوچا جو ابھی ابھی تیار ہو کر Kiss me on monday کی دھن میں سیٹی بجاتا ہوا اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر عاجزی سے مسکرایا۔

''ارے یار کیوں راہ کھوٹی کرتا ہے۔'' انہوں نے اس سے نظریں چرا لیں۔ ''تیرے لیے تو ابھی بہت وقت پڑا ہے' بلکہ قاعدے سے تو آیا ہی نہیں' اور میرا وقت مجھے چھوڑ کر بھاگ رہا ہے۔ ہم کو یہ مہلت دی ہی کب گئی تھی۔ ارے کامیاب نہ سہی ناکام محبت ہی کا مزہ تو لے لینے دے اور اچانک ہی ان کو جمیلہ سعید پر غصہ آ گیا۔ جا رہا ہو گا پاجی وہیں۔ اس نے ڈینٹ دے رکھی ہو گی۔ وہ چڑیل' لڑکی ہے کہ بندوق کے غلاف میں پھنسی ہوئی بارہ بور۔ سور نہیں تو! ابھی زمین سے اٹھا نہیں اور محبت کے معرکے شروع ہو گئے۔ آوارہ۔۔۔۔۔۔ آوارہ' کم بخت ٹیڈی نہیں تو۔'' ان کا غصہ بڑھتا ہی گیا' ہرگز نہیں دوں گا چابی' انہوں نے پتلون کی جیب پر ہاتھ جما کر سوچا' آج تو مجھے ہاجرہ کی ضرورت سننا ہے۔

اور وہ بڑے سعادت مند فرزند کی طرح گردن ڈالے ان کے سرہانے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''کیوں کیا ہے!'' آواز غصیلی اور کڑھی ہوئی تھی۔

''جی' وہ آپ نے کہا تھا کہ لے جانا گاڑی۔'' اس کی گردن اور بھی لٹک گئی۔

''نہیں' آج مجھے ضروری کام نکل آیا ہے۔ گاڑی نہیں دی جا سکتی۔''

''آپ کو گاڑی کس وقت چاہئے۔''

''چھ بجے۔'' ان کے من سے صحیح بات نکل گئی۔

''گاڑی آپ کو ساڑھے پانچ بجے مل جائے گی۔'' اس کی آواز بھاری تھی۔

ارے! وہ چونک گئے یہ واقعی بہت بڑا ہو گیا ہے۔ اس کا سیدھا اور لمبا قد مضبوط اور توانا خدوخال جذبات سے مملو آنکھیں۔ اس کو دیکھ کر کچھ یوں محسوس ہوا جیسے صبح صادق طلوع ہو رہی ہو۔ اس کی ماں کو تو اس کے سہرے کی کھلتی ہوئی کلیوں کی مہک بھی آنے لگی ہو گی۔

انہوں نے اس کی ماں کی طرف دیکھا جو ٹیپو کی کلیجے سے لگائے ناوقت سو رہی تھی اور اس کی پیٹھ میں بالکل چپکا ہوا ٹیپو سے بڑا والا سو رہا تھا۔

''اب تم اپنی خرافات بند کرو اور سنجیدگی سے پڑھائی کرو۔ گاڑی اس وقت نہیں ملے گی۔'' ان کا غصہ بڑھ رہا تھا' آواز میں رشک وحسد کی آمیزش تھی۔

شہباز کا مجھ لٹک گیا اور اس کا لٹکا ہوا چہرہ کتنا دلچسپ نظر آ رہا تھا' بانکا بانکا سا تیکھا تیکھا اور خاموش خاموش۔ انہوں نے کنکھیوں سے اس کو دیکھا' ان کی نوعمری یہ کیا ان کے سامنے ہی تو کھڑی تھی جیسے کسی نے مٹتی ہوئی شبیہ کے نقوش کو لے کر اجاگر کر دیا ہو' شہباز کے قدم بے خیالی میں ماں کے پلنگ کی طرف اٹھ گئے اور اچانک ہی ان کی مت پلٹ گئی۔

''سنو شہباز' پھر تم لے جاؤ گاڑی' مجھے وقت پر واپس کر دینا۔'' انہیں معلوم تھا کہ اس نے آج تک گاڑی وقت پر واپس نہیں کی تھی۔ ''اور تم کو کچھ پیسے بھی چاہئیں؟''

مسرت کی ایک معصوم لہر اس کے بجھے ہوئے چہرے پر دوڑ گئی۔ ''جی' جی۔۔۔۔۔۔۔ دے دیجئے۔''

اس رات ڈاکٹر ہاجرہ کی ماں نے مطمئن سانس لے کر اپنی چھوٹی لڑکی سے کہا ''شکر ہے کہ وہ راضی ہو گئی' مجھے تو ڈر تھا کہیں اس کم بخت نو بچوں کے باپ کے چکر میں ہاجرہ اس رشتے سے بھی انکار نہ کر دے۔''

اور ہاجرہ نے پردے کی آڑ سے ان کی بات سن کر دل میں کہا' اور جو اگر وہ نو بچوں کا باپ آج چھ بجے میرے دفتر پہنچ جاتا' تو میرا فیصلہ کس قدر مختلف ہوتا اور آپ کو شاید اس وقت اس خوشی کے اظہار کا موقع نہ ملتا۔

ہاجرہ نے دبی دبی سی ٹھنڈی سانس لی اور نو بچوں والے باپ کی خوبصورت آنکھوں اور دل آویز شخصیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے

صبر کرلیا۔

ایک ہفتے تک برتن توڑنے' بات بات پر غصہ کرنے اور سر کے درد میں مبتلا رہنے کے بعد ان کے چہرے پر وہ سکون نظر آ رہا تھا جو طوفانی انداز کی بارش کے بعد صاف مطلع پر چھا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ ''بھئی شائستہ اگلے ہفتے ہم کاغان چل رہے ہیں۔'' انہوں نے اپنی پرانی عادت کے مطابق کہا۔

اپنی شلوار کے سلے ہوئے پائنچے درست کرتے ہوئے سر جھکا کر کہا ''میں اتنے بچوں کو لے کر کہاں جاؤں گی۔ یہ ہو بھی گئے ہیں واقعی بہت شریر اور بدتمیز۔''

دو سال سے وہ برابر بچوں کی کچر پچر کا ذکر کر کے ان پر اصرار کرتے کہ تم بچوں کو لے کر مری چلی جاؤ۔ میں یہیں رہوں گا اور پھر خود ایبٹ آباد چل دیے۔

''ارے نہیں بچوں کو مری میں چھوڑ دیں گے ہم تم چلیں گے۔''

''ہونہہ مری میں چھوڑ دیں گے۔ آ گئے گڑبڑ مچانے۔'' زرینہ چپکے سے بڑبڑائی۔

انہوں نے اپنی بات جاری رکھی ''اور یہ ٹیپو مدمعاش ہرگز نہیں جائے گا بہت بدمعاش ہے یہ!'' انہوں نے ٹیپو کو ماں کی گود سے لے کر ہوا میں اچھالا۔ ''بس ہم اور تم دونوں چلیں گے۔ یاد ہے ہم ہنی مون پر بھی تو اکیلے ہی کشمیر گئے تھے۔''

''جب کی بات اور تھی۔'' شائستہ نے سر جھکا لیا۔

''اب بھی وہی بات ہے شائستہ'' وہ اپنی بیوی کے پاس بیٹھ گئے ان کی آنکھوں میں صداقت دیکھ کر شائستہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ساٹھ' اکسٹھ' باسٹھ آخری بار زینوں کا فاصلہ طے کر کے امی جی پاس رکھے ہوئے اسٹول پر دم لینے کو بیٹھ گئیں۔ پسینا ان کے انگ انگ سے پھوٹ رہا تھا اور وہ بری طرح ہانپ رہی تھیں۔

''آپ نے پھر وہی اکسٹھ' باسٹھ شروع کر دی۔'' زرینہ نے ہمدردی سے کہا۔

''ہاں زرینہ ایکسرسائز تو صحت کے لیے اچھی ہوتی ہے۔'' ان کی آنکھیں پر رونق تھیں اور چہرے پر امید کے دیے جل رہے تھے۔

اور زرینہ افسردگی سے سوچ رہی تھی' میری بے چاری امی پھر جوڑے کی بندشوں' ساری کی سلوٹوں اور لپ اسٹک کے تیز اور ہلکے رنگوں کے چکر میں پڑ گئیں۔ اس کو اپنے اور اپنی ماں کے درمیانی فاصلے پھر بہت طویل نظر آ رہے تھے' اس لیے کہ اس کا پرانا حریف واپس آ گیا تھا۔

◆◆◆

سلور کنگ

جھٹ پٹے کے بہت بعد جب شام کے سائے گہرے ہو جاتے تو وہ ایک طویل انگڑائی لیتا۔ بگلے کے سگریٹ کے انتہائی چھوٹے ٹرے کو انگشت شہادت اور انگوٹھے کے درمیان بے دردی سے دبا کر مٹھی سی بنا لیتا اور ایک طویل کش لے کر دھسک دھسک کھانستا۔ وہ کھانسی جو صرف ٹوٹتے ہوئے مایوس دل سے نکلتی ہے۔ کندھے پر سے جھاڑن اتار کر اپنے بے دانتوں کا مجھ پونچھتا اور جھولتے ہوئے قدموں سے اپنے کلبہ احزاں کی طرف جاتے جاتے ہو چتا۔

''تو زندگی کا ایک اور دن ملکہ کے بت پر تمام ہو گیا۔''

اور یہ تھا ''سلور کنگ'' کلجھوے رنگ' غول بیابانی کی سی پیلی گرسنہ اور روٹھی ہوئی نگاہ اور پچکے گالوں والا' لانڈری کی دھلی ہوئی بوسیدہ وردی' سفید ٹینس شو اور پیتل کی چپراس اور طرے دار صافے والا سلور کنگ جو سالہا سال سے صبح ملکہ کے بت پر آ کر یوں بیٹھا کرتا گویا یہ بھی اس کا کوئی مقدس فریضہ ہو۔ اب یہاں کسی ملکہ کا بت نہ تھا۔

سامنے اسمبلی کی خاموش اور متین عمارت ہوتی اور ہٹائے ہوئے بت کے خالی استھان کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوتا۔ وہ خود تھی تو ایک ایسا دیوتا تھا جو اپنے استھان سے گر چکا تھا۔

ان کئی سالوں میں ملکہ کے بت پر کتنے ہی بیرے خانسامے بڑے طمطراق سے آ کر بیٹھے بڑے بڑے انگریزوں کے قصے اور داستانیں لیے اور ان کے دیے سرٹیفکیٹ احتیاط سے جیبوں میں رکھے' بہت بڑھ بڑھ کر بولے اور پھر وقت کے آگے ان کو ہتھیار ڈالنے پڑے' انہوں نے بھی سانولے اور پکے رنگوں کے دیسی صاحبوں کو دیکھ کر خوب ناک بھوں چڑھائی' کرنل اوبرائے اور ڈاکٹر لوئیس کے حوالے دے دے کر ان کو خوار کرتے رہے۔ آخر آہستہ آہستہ ان پر یہ حقیقت دیسیوں سے ساز باز کر لی ہے' چنانچہ رفتہ رفتہ سفید وردیوں' صافوں اور پیتل کی چپراسوں کا بظاہر مودب لیکن در پردہ حد درجہ گستاخ جم غفیر اب کم ہونا شروع ہو گیا' ذرا کوئی موٹر یا نوکر کا متلاشی صاحب کو سلیوٹ مارتے اور سرٹیفکیٹوں کی پاسپورٹ نما مجلد کتابیں پیش کر دیتے کہ زمانہ سازی اسی کا نام تھا۔

''کیا بات تھی انگریز صاحب لوگوں کی۔'' یہ فقرہ اب ضرورت کے بوجھ تلے دفن ہو گیا تھا۔

مگر سلور کنگ کی کیا بات تھی۔ وہ نوکریاں کرتے اور پھر مالکوں سے جھگڑ کر دوبارہ ملکہ کے بت پر بیٹھنے آتے تو سلور کنگ کو بدستور

ملکہ کے خالی استھان سے ٹیک لگائے بیٹھے پاتے۔

''ارے یار سلور کنگ تم پھر یہاں آ بیٹھے۔'' وہ حیرت سے سوال کرتے۔

''تو گیا کون تھا۔'' وہ حقارت سے کھانس دیتا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو میں ایسے الٹے سیدھوں کی نوکری کروں گا''

وہ اجلا لیکن بوسیدہ جھاڑن جھٹک کر پھر کندھے پر ڈال دیتا۔

''تو پھر یہاں بیٹھے کیوں ہو؟'' ایک دن لمبے دبلے مدقوق نذیر بیرے نے پوچھا جواب تیسری بار روزگار کی تلاش میں یہاں آ کر بیٹھا تھا۔

''مجھے تو پکے صاحب کی تلاش ہے۔ چلو انگریز نہ سہی' صاحب تو پکا ہو۔'' وہ بڑے عزم سے بولا۔

''ارے استاد ہٹاؤ بھی یہ ضد' دیکھتے نہیں ہو زمانہ نام پوچھ رہا ہے۔ اپنی تو ہفتہ بھر کی بے کاری میں سٹی گم ہو جاتی ہے۔''

اچھا نذیرے ایک بات تو بتا۔'' سلور کنگ نے فلسفیانہ انداز میں پوچھا۔

''کیا بات؟''

''یہی کہ تو اس مرتبہ کیوں نوکری چھوڑ آیا' تجھے میری قسم سچی سچی بات بتائیو۔''

نذیر نے بوسیدہ قمیص کی جیب ٹٹول کر ایک کمر ٹوٹا بگلے کا سگریٹ نکالا اور اپنے پیلے پیلے متعفن دانت نکوس کر ہنسا۔

''ایمان کی بات یہ ہے چاچا کہ اس مرتبہ مجھے صاحب برا نہیں ملا تھا' بس بیگم آفت کی پڑیا تھی' ذرا ذرا بات پر دم جاتا تھا اس کا۔ اتنا کوئلہ کیوں جلا رہے ہو' چائے کی پتی اتنی کیوں خرچ کی' بس ہر وقت چک چک کیا کرے تھی۔''

''لو بھلا اب یہ بھی کوئی بات ہوئی' ارے صاحب لوگ کا میم لوگ بھی تو ہوتا تھا۔'' سلور کنگ کی پرانی رگ پھڑک آئی اور وہ خاص صاحب لوگ والی اردو بولنے پر اتر آیا۔

''استاد ان کی مت کہیو' وہ حرام کی کمائی لٹاویں تھیں۔'' رام پوری خانساماں دلدار جھٹ بولا۔

''بس رہنے دے دلدار' ایسا بات مت بول' پھر ہم زبان کھولے گا' تو تم لوگ کے مرچیں لگ جائے گا باڈی بھر میں' کیوں بھئی اپنے ایمان سے بول بھئی نذیرے یہ کالا صاحب لوگ حلال کی کمائی کھاتا ہے؟''

''ارے توبہ کرو بھئی' کیوں بدگوئی کراتے ہو۔ اپن نے تو جتنے صاحب لوگ کی ملازمت کی اتنی گھوس' اتنی گھوس کھاتا ہے کہ اپن تو یہی سوچتے ہیں یہ سالا پاکستان چل کیسے رہا ہے۔ مجھے تو یہ لگتا تھا' جیسے سارے پاکستان کی دولت بس اسی صاحب کے گھر اٹھ آئی

ہے۔ پٹرول تو جانو اس کے نلکوں میں آتا تھا اور کپڑا اور سونا تو بس اسی گھر میں اگ رہا تھا' مگر بیگم بڑی پیڑی تھی۔''

''ارے بابا ہم سے پوچھو۔'' سلور کنگ نے اپنی خدمات پیش کیں' ''ہم بتائے گا' ہم جانتا ہے ان بیگم لوگ کو۔ اتنا گھمنڈی اور اتنا شو آف کرنے والا اور خدا تمہارا بھلا کرے' جرا جو تمیز ہو سالے گرمی کے دنوں میں گہرے گہرے اودے اور سرخ کپڑے پہن لیے اور ہر رنگ کے سوٹ پر گہری خون جیسی لپ سٹک تھوپ لی اور میم لوگ کی حرص میں ناخون لمبے کر کے اس پر بے تکی سرخی لیپ کر' بال کٹا کر اپنے حسابوں میم صاحب بن گئی اور لگی ٹک ٹک پھرنے اور جو دل دیکھو تو چڑیا کے ماف جرا میں پھڑ پھڑ کرنے لگتا ہے'' سلور کنگ نے ہاتھ ہلا کر بتایا' ''ایسی سسریوں کا بس نہیں چلتا کہ بیرے خانساموں کے پیٹ پھاڑ پھاڑ کر ان کا کھایا پیا بھی نکال لیں۔''

اس نے ایک سانس میں اتنا کچھ کہہ ڈالا۔

''جے تو استاد تم نے سچ کہا'' رحمت نے وہیں قریب ہی سیڑھیوں پر لیٹے لیٹے بیڑی سلگائی' ''میری بیگم ایسی جالم تھی کہ مجھے سوکھے پچاس پر رکھا تھا تو اکیں جانتا سلور کنگ کیا مزال تھی جو پینٹری سے ایک توس یا چمچہ بھر سبزی مجھے لے جانے دی ہو۔''

''پھیر تم دیکھو!'' سلور کنگ نے فاتحانہ آنکھیں چمکائیں اور اس کو محسوس ہوا کہ اس کی بھوکی انتڑیوں کو اس انکشاف سے بڑی تسکین ہو گئی ہو' رحمت نے بات جاری رکھی۔

''اور یہ دیکھو ایسی کنغک تھی کہ ایک دن گرمی تھی کہ بس نام پوچھے تھی اور میں جو بازار سے دو میل سائیکل چلا کر آیا تو تم جانو ڈھونکی سی لگ گئی' میں نے کتا ہی پانی پی ڈالا چین ہی نہ پڑا' تو تم یہ دیکھو کہ میں مشین میں فل فروٹ رکھنے کے بہانے گیا تو ایک ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر اپنے کوارٹر میں لیتا گیا اور اس سالی نے نہ جانے کیسے دیکھ لیا بھائی میرے' دوسرے دن تو فرج کو تالا لگ گیا۔

''ارے بھائی میرے یہ دیسے تو ایسا ہی کریں گے'' سلور کنگ نے کان پر لگا ہوا سگریٹ کا ٹرا سنبھال کر انگلیوں میں دباتے ہوئے کہا۔

''ارے یار تو تمہارے انگریج ہی کون سا گھر بھر دیویں تھے۔'' جادو مستری نے کہا جو سلور کنگ سے کچھ کم سینئر نہ تھا۔ وہ شملہ میں وائسرائے لاج کے فلش ٹھیک کیا کرتا تھا۔

بس بات میں بات چلتی رہتی اور یوں ہی دن تمام ہو جاتا' کئی بے کار روزگار سے لگ جاتے اور کئی بے روزگار ہو کر ملکہ کے بت پر آ بیٹھتے' ایک چائے کی پیالی اور سوکھے بند پر دن گزر جاتا اور کبھی یوں بھی ہوتا' ایک نان تھوڑے سے چھولے کھانے کو مل جاتے' تو اس دن سلور کنگ کی طبیعت زور پر آ جاتی' وہ جھاڑن سے منہ پونچھتا اور کسی نہ کسی جیب سے سگریٹ ٹٹول کر نکال ہی لیتا' اس کو بڑے

اہتمام سے سلگا کر کش لیتا اور پھر منہ اونچا کر کے فضا میں آہستہ آہستہ دھواں چھوڑتا اور دیر تک آنکھیں سکیڑے ان اٹھتے بل کھاتے مرغولوں کی طرف تاکا کرتا' جیسے ان میں اس کا سنہری ماضی ناچتا بل کھاتا فضائے بسیط کی پہنائیوں کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہو۔ یوں معلوم ہوتا جیسے گزرے ہوئے لمحوں اور بیتی ہوئی آنوں کا وہ سلسل جھرنا بہتے بہتے کہیں ٹھہر گیا ہو۔ وقت کی وہ دبیز چادر جو ماضی کو حال سے جدا کرتی ہے' وہیں کہیں بلندیوں کی طرف رہ گئی ہو اور ماضی کے وہ دن ایک مصور داستان کی طرح ورق ورق ہو کر اس کے سامنے چلے آ رہے ہوں' آہ! وہ دن جب سیسل اور میٹروپول کی عشرت بار موسیقی کی گتوں پر وہ آن بان سے اونچے اونچے انگریزوں یعنی صاحب لوگوں کی میزوں پر کافی اور بڑھیا شرابیں سرو کیا کرتا اور چاندی کی پلیٹ میں بل لگا کر ان کے سامنے مودب جاتا اور کلف زار مور کے پنکھ کی طرح سجیلے طرے دار صافے والا سر جھکا کر ان کے سامنے بل پیش کرتا' اور ہائے وہ صاحب کا انداز سے بٹوہ نکال کر بل ادا کرنا' سگریٹوں اور شراب کی مخمور اور بوجھل فضاؤں میں بیٹھے ہوئے صاحب اور ان کی نیم عریاں میم لوگ اور شیشوں کے باہر سے نظر آتے ہوئے شملے کے مناظر۔ آہ! وہ عشرت نگاہ اب کہاں میسر تھی' اس کا ترسا ہوا ذہن بار بار سوچتا' میں نے کیا گناہ کیا تھا جو اس سے محروم ہو گیا۔ ہائے! افسوس میں نے تو کبھی کسی دیسی کی میز پر ایک پیالی چائے بھی نہ رکھی تھی اور یہ حقیقت تھی کہ نہ وہ کسی دیسی صاحب کے کمرے کا چارج لیتا تھا اور نہ کبھی ان کی میز پر جاتا تھا وہ پہلے ہی بڑی حقارت سے کہہ دیا کرتا ''توبہ کرو میں جاؤں گا نیٹو کی میز پر۔'' یہ نیٹو کا لفظ بھی اس نے اپنے صاحب لوگوں سے سیکھا تھا۔ وہ غصے میں چلبلا کر اسے ایڈیٹ نیٹو کہہ دیا کرتے تھے' ان کی زبان سے نکلا ہوا یہ لفظ اس کو برا نہ لگتا' مگر یہی لفظ حربے جربے وہ دیسی صاحب لوگوں کی پیٹھ پیچھے ان کے سر دے مارتا تھا' وہ جان بوجھ کر ان کو ذلت دیتا' اس کے آبنوسی چہرے پر ایک فاتحانہ رنگ ہوتا اور صاحب لوگوں کی بوتلوں کی تلچھٹ کے اثر سے نیے ہو جانے والے ہونٹ سکیڑتا اور پھر کوڑی کے مانند پیلاہٹ لیے ہوئے سفید دانت نکال کر ہنس دیتا۔

نامعلوم کون سا جذبہ انتقام اس کی رگ رگ میں لاوے کی طرح کھولتا رہتا تھا' اس کا بس چلتا تو اپنے صاحب لوگوں کو مشورہ دیتا کہ ان نقلی صاحبوں کو صفر بہ صف کھڑا کر کے ان کے منہ پر تھوکیں اور بار بار دہرائیں ''ذلیل نیٹو۔''

اور اب وہ اور ان کی نوکری کرے' خدا کی شان اس کی رگ رگ میں نفرت اور حقارت کی آگ بھڑک اٹھتی' وہ جو صاحب لوگوں کے وقتوں میں اتنا محتاط تھا کہ اگر اتفاق سے کسی دیسی کے پاس بل لے جانا پڑتا تو چمکتی ہوئی تھالی میں ٹپ کے طور پر چھوڑی ہوئی ریز گاری اسی وقت کسی نئے چھوکرے کو اس انداز سے پکڑا دیتا جیسے وہ کسی کوڑھی کے چھوڑے ہوئے پیسے ہوں۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا تنگ دستی اور فاقہ مستی کے ساتھ ساتھ دیسی صاحبوں کے خلاف اس کی زبان کے نشتر بھی تیز ہو رہے

تھے۔ وہ ازراہ انتقام ان کے بنگلوں پر جاتا' ان سے نوکری کی بات کرتا اور پھر گھما پھرا کر ان کو سنا آتا' تم کیا جانو انگریزی کھانے کی قدر' کبھی بیرا اور کک رکھا بھی ہے اور پھر کئی دن تک اس کے جھلستے ہوئے کلیجے میں جیسے برکھا کے چھینٹے سے پڑ جاتے۔

بھوک سے اینٹھی ہوئی آنتیں اور تنگ دستی کی سوچ سے تنی ہوئی رگیں بھی اس کو حقیقت کے آگے سپر ڈالنے پر مجبور نہ کر سکیں۔ وہ چھڑا دم تھا۔ اس نے اونچے قسم کے ''اہنے'' صاحب لوگوں کی طرح یہ علت کبھی نہ پالی تھی' اس نے دنیا کا ہر رنگ دیکھا تھا اور جی بھر کر عیش کیا تھا۔ ایک سے ایک بنگالن' مدارسن اور برمی آیائیں اس کے اشاروں پر ناچ چکی تھیں اور اب اس کا دل ہر چیز سے سیر تھا۔

اب تو مدتوں سے وہ ملکہ کے بت پر بیٹھ کر اونچا روزگار تلاش کرنے والوں کا بلا مقابلہ صدر تھا۔ اس گروہ کی مسلسل صدارت نے اس کے اندر عجیب شان استغنا پیدا کر دی تھی۔ اس کے انداز مربیانہ تھے اور اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ یہ تھا کہ چھٹے چھ ماہے گورنمنٹ ہاؤس کی دعوتوں' یا جم خانے میں جب ایکسٹرا بیرے درکار ہوتے تھے تو بڑے نخروں سے اور بڑی تگڑی اجرت پر جا کر اپنی نگرانی میں میزیں وغیرہ لگوا دیتا۔

موسم گرما کے وسط میں ایک زمانہ ایسا بھی آتا جب ملکہ کے بت کی تمام سیڑھیاں خالی ہو جاتیں اور اس کے اردگرد سبزہ زار پر اکا دکا فاقہ زدہ سی شکل منہ اوندھائے پڑی نظر آتی تو سلور کنگ اسی طرح استھان سے ٹیک لگائے غنودگی کے عالم میں بیٹھا رہتا۔ پوپلا سا مجھ کھولے' مندی مندی آنکھوں سے میلا پانی بہتا ہوا' ان دنوں اس کے ہاتھ میں سگریٹ کے بجائے بیڑی نظر آنے لگتی تھی۔

جوں جوں موسم کی تمازت میں کمی آتی جاتی' ملکہ کے بت کی رونقیں واپس آنے لگتیں' تاشوں کی بازیاں جمتیں' کان میلے اور تیل مالش کرنے والے ادھر ادھر منڈلانے لگتے۔ بعض دفعہ تو تاشوں کی بازیوں اور گپوں کے انہماک میں بیروزگاروں کو خبر بھی نہ ہوتی کہ نوکری آ کر پلٹ گئی' ایسے میں سلور کنگ کی بادشاہت ہوتی' بھوکے چہروں اور چالاک نگاہوں کے درمیان بیٹھے بڑے بڑے پتوں اور راز کی باتیں بتایا کرتے' سگریٹ سلگاتے' بڑے انداز سے چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتے' حسرتوں کے مدفن سینے میں دھوں دھوں کھانسی کی آوازیں نکالتے اور پھر جھاڑن سے منہ پونچھ کر بڑے فلسفیانہ انداز میں مخاطب ہوتے۔

''تو یار میرے یہ بات گرہ میں باندھ لو کہ صاحب کیج غائبت (غیبت) میں بیگم کا لور آئے تو بس اس کے آگے بچھ بچھ جاؤ' اور ہاں' یہ یاد رکھو کہ بس بیگم الو کی پٹھی پر یہ ضرور بل ضرور سے یہ جتا دو کہ ہم کو سب پتا ہے یہ تمہاری عاشکی معسوکی دھندا' بس پھر تمہاری چاندی ہے دیکھو تمہاری کیسی بند ہوا غلام بنتی ہے۔''

''ارے استاد! کیسی بات کرتے ہو بھلا اونچے گھروں کی بیگمیں کاہے کو کسی سے آنکھ لڑانے لگیں'' کوئی نوگرفتار بول پڑتا۔

''چپ کر جا' ڈیمٹ۔ فول کہیں کے' آیا بڑا ارسطو بن کر' چار دن سے بنگلوں میں شعلچی گیری کرنے لگا ہے' تو اپنے کو بڑا اسٹوارڈ سمجھ بیٹھا ہے۔'' اور ایک دم وہ تن کر بولتا۔ ''ارے ہم سے پوچھو ہم کیا کچھ دیکھے بیٹھا ہے' کیسی کیسی حرافہ میم لوگ ہماری مٹھی کے بیچ رہا ہے۔ ذرا سی آنکھ بدلتا تھا' تو میم صاحب کا باڈی بھر کانپ جاتا تھا۔ اور کرنل اوبرائے کی میم کو عین وخت پر ٹوک دیا تھا' تو آکین کر کے جاننا کے ہمارے آگے اس ماٹک دوزانو ہو کر گئی مانو چجز (جیزز) کے بت کے آگے بیٹھی ہو اور تم جانو کہ اسی دن ہم کو مہینہ بھر کے فرلو (اونہہ بھائی تم سمجھتے نہیں فرلو سے مطلب لانگ لیو' ارے بھئی لمبی چھٹی ہے) پر بھیجا۔ بھاڑا الگ دیا اور سو کا نوٹ کھرچنے کو ملا اور صاحب کا ادھا درجن شرٹ دیا وہ گھاتے میں۔''

اور اب جملہ ختم کر کے وہ اپنی پیلی پھٹارہ سی آنکھیں گھما گھما کر مجمعے کی طرف دیکھتا' دونوں ہونٹوں کو بھینچ کر بند کرتا' پھر پیر سمیٹ کر خستہ اور مگر مچھ کی طرح منہ پھیلائے ہوئے ٹینس شو کی ڈوریاں کس کر باندھتا اور مجمعے کو گویا سانپ سونگھ جاتا' دم بخود بیٹھے ہوئے اور سو سو کے نوٹ ہوا میں اڑتے اور پھٹ پھٹاتے محسوس ہوتے۔۔۔۔۔۔۔ آہ وہ عہد رفتہ۔ ایک مدت عالم خاموشی میں رہنے کے بعد وہ جمائی لیتا اور بجھے ہوئے سگریٹ کے ٹرے کو پھر احتیاط سے جلا کر اپنی داستان شروع کر دیتا' صاحب لوگوں کی غرفش اور پرانی میموں کے اسکینڈل بڑے ڈرامائی انداز میں چل پڑتے' یوں میں نے بیرے نکلس (بیورے نکولس) کے آگے چائے سرو کی' یوں مانٹ بیٹن (ماؤنٹ بیٹن) نے ٹی پاٹ پکڑا' یوں لنتھگو (لن لتھگو) کی لیڈی مجھے دیکھ کر مسکرائی۔۔۔۔۔۔ ایک قصہ نا تمام تھا' اک عرض مسلسل تھی کہ سالوں سے چل رہی تھی۔

بس یوں ہی جھٹ پٹا شاموں میں تبدیل ہوتا رہا۔

ہر صبح ایک نئی امید اور فریب مسلسل لے کر نمودار ہوتی۔ وہ بستر سے اٹھتا' چیتھڑا سی لنگی اور بنیان اتار کر الگنی پر ڈالتا۔ ٹین کی پیٹی میں کھسیانوں کے سے دانت نکوستی ہوئی پرانی وردی نکال کر اہتمام سے پہنتا۔ کھریا سے بوسیدہ ٹینس شو کو سفید کرتا' چپراس لگاتا اور چھوٹے سے کسیرونما سر پر بوسیدہ کلاہ پر جما ہوا صافہ اٹھا کر جما لیتا اور بڑی آس لے کر ملکہ کے استھان سے ٹیک لگا کر جا بیٹھتا۔ کبھی تو اس کو بھی کوئی پکا صاحب مل جائے گا جو دیسیوں کی طرح تھڑدلا نہ ہوگا' جو امریکن صاحب لوگوں کی طرح بے ڈھنگا اور اول جلول نہ ہو گا' جو بالکل پکا صاحب ہوگا' گردن اکڑائے' سگار منہ میں دبائے' ٹھوکر سے بات کرنے والا اور دنیا کو یوں دیکھنے والا جیسے پربت کی سب سے اونچی چوٹی پر سے نیچے کو دیکھتا ہو۔

ایک صبح کو بے روزگاروں کے مجمعے میں ملکہ کا استھان سونا تھا' سلور کنگ غیر حاضر تھا' کئی چالاک نگاہیں گھومیں اور کئی مکار چہرے

مسکرائے''''استاد کو پکا صاحب مل گیا۔''

''ارے پکا نہ کچا' بس اب کہاں تک دکھ اٹھاتا' دیکھا نہیں گرمی میں فاقوں کے مارے مینڈک کی طرح پیلا ہوا پڑا تھا۔'' نذیز نے کہا جو پچیسویں مرتبہ آج پھر بے روزگار ہو کر آ بیٹھا تھا' اس جرم کی پاداش میں کہ اس نے صاحب کی ''غائبت'' میں آنے والے بیگم کے مہمان کو ٹرا کر جواب دے دیا تھا۔ کئی دن ملکہ کے بت پر سلور کنگ کی نوکری کا اسکنڈل یوں گرما گرمی سے زیر بحث رہا جیسے کسی اشراف زادے کی جوان بیٹی بھاگ گئی ہو۔

اور پھر مئی کی ایک تپتی ہوئی دوپہر کو بیری والے احاطے کے عقب سے چند ملگجی سفید وردیوں اور پیتل کی چپراسوں والے انسانوں کی محنت کے بار سے جھکے ہوئے کاندھوں پر ایک پلنگ تھا جس پر مارکین کی ایک پرانی سی چادر تھی۔ یہ عاشق کا جنازہ نہ تھا جو دھوم سے نکلتا۔

مگر ملکہ کے بت کا استھان خاموش آنسو بہا رہا تھا جیسے آج پہلی دفعہ اس کو محسوس ہوا ہو کہ اس پر رکھا ہوا وہ سنگین پر وقار مجسمہ اٹھا لیا گیا ہو۔

فضا مٹیالی اور گھٹ گھٹی تھی' اسمبلی کی عمارت خاموش تھی' فری میسن ہال کی عمارت پر چیلیں اور گدھ منڈلا رہے تھے اور ٹیکسی اسٹینڈ ویران پڑا تھا۔

مختصر سا یہ جنازہ بردوش جلوس آگے بڑھا اور چیرنگ کراس کے سپاہی نے بڑے انداز سے پینترا بدل کر ٹریفک روک دیا۔

◆◆◆

واپسی

سارے اسکول میں خبر اڑ گئی کہ پامیلا روتھ سینٹ فرانسس کے ڈفیل سے لڑکے سرل کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ سینئر کے علاوہ جونیئر اسکولوں کے لڑکے لڑکیاں بھی درمیانی وقفوں میں کوری ڈور اور زینوں کے علاوہ ٹک شاپ اور پانی کے مٹکوں کے پاس ٹولیاں بنائے پامیلا روتھ کے اس چھوٹے سے اسکنڈل پر اس شدومد سے خیال آرائیاں کر رہے تھے کہ استانیوں تک کے کان کھڑے ہو گئے۔

پڑھائی کی محنت سے سنولائے ہوئے دبلے دبلے ذہین چہرے' گول طباق سے مکار چہرے اور بھولے رخساروں والے معصوم چہرے بھی پریشان اور سنجیدہ نظر آ رہے تھے' چمکتی ہوئی شوخ شوخ آنکھوں میں اعتراض کی صاف صاف جھلک موجود تھی تو خیر سے یہ ٹانگ برابر برابر لڑکے لڑکیاں بھی اس قابل ہو لیے کہ ایسی ایسی خبروں پر چونکنے لگے' گھاگ قسم کی بڈھی استانیوں نے اپنی ناکوں پر عینکیں ٹھیک سے جما کر سوچا اور نوجوانی کی سرحدوں کو تیزی سے پار کرتی ہوئی مسیں بھی خوف زدہ ہو کر چونک سی پڑیں' تو ان کے شاگردوں کی یہ کھیپ بھی اسکینڈلوں پر خیال آرائی کرنے کے قابل ہو گئی اور وہ خود ابھی تک کوئی ڈھنگ کا آدمی بھی نہ ڈھونڈ پائیں۔

اور مس نورین اور کھیم چند نے روم کی سیلی ہوئی دیوار پر لگے ہوئے چتکبرے اور دھندلے آئینے کے مقابل کھڑے ہو کر جلدی جلدی اپنے لبوں پر لپ اسٹک کی ایک تہ اور جمائی' اور پھر دونوں ہی بہانے بہانے سر ناصری کی کرسی کے قریب والی کرسیوں پر بڑے پوز سے جا بیٹھیں اور اس دن اونٹ کی طرح لمبے اور سوکھے' چرخ سر ناصری اپنی کلاس سے باہر ہی نہ نکلے۔ وہ ایس سی کے پانچ' چھ لڑکوں کو لیے بیٹھے اسکیل ڈرائینگ کے چند بنیادی اصول سمجھاتے رہے۔ اس انتظار سے اوبھ کر مس کرمس کھیم چند اور نورین دونوں ہی بہانے بہانے چند منٹوں کے وقفوں سے باری باری نکل گئیں۔

فورتھ اسٹینڈرڈ کے قریب والے پانی کے مٹکے کے پاس نو اور دس سال کی درمیانی عمر کی بچیوں کی ایک ٹولی جلی بھنی کھڑی تھی جیسے پامیلا روتھ نے اپنی بدعنوانیوں سے ان کی سخت توہین کر دی ہو۔ ایک دبلی پتلی سی جھبرے بالوں والی سانولی سی بچی جس کے موزوں سے ہمیشہ مرے ہوئے چوہوں کی سی بدبو پھوٹا کرتی تھی' بڑے جوش میں تقریر کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے تھوک اڑ اڑ کر دوسرے بچوں کے چہروں اور بالوں پر پڑ رہا تھا۔

''بڑا شوما را کرتی تھی' اب دیکھ کتنی پٹائی ہوگی' اشلے کو پتا چلے گا' تو خوب کینگ ہوگی مس صاحبہ کی۔''

''کیا پتا جوڈنسز کیپ ہی پہنا دی جائے اس کو!'' سرخ چقندر سے منھ والا طارق ہمیشہ بے تکی اڑایا کرتا تھا۔

شی شش ڈیکنز گزر رہی ہے' کسی نے اطلاع دی۔ مصری ممی کی طرح بے روح اور تختے کی طرح سیدھی اور اکڑی ہوئی ڈیکنز ٹھوڑی تک اٹھے ہوئے کالر اور گٹوں تک کے کفوں والے سفید لباس میں کھٹ کھٹ کرتی اپنا سخت اور سفید چہرہ اٹھائے پاس سے گزری چلی گئی۔ کھیم چند جلدی سے کھٹ کھٹ کی آڑ میں ہوگئی۔ ڈیکنز دو سال پہلے والے قصے کے بعد سے اس پر کڑی نظر رکھتی تھی۔

''بھئی' پامیلا روتھ کو تو ڈیکنز کے حوالے کیا جائے گا۔'' ایک چھوٹے قد کی گیارہ سالہ لڑکی نے آنکھیں مٹکائیں۔

دراصل سینٹ فرانسس کے برزف سرل کے ساتھ پامیلا روتھ کے رومانس پر کسی کو اعتراض نہ تھا' بلکہ بات صرف اتنی تھی کہ گلابی گالوں اور روشن آنکھوں والی پامیلا روتھ سے ہر ایک کو کوئی نہ کوئی شکایت تھی۔ بڑی لڑکیوں کو شکایت تھی کہ اس کے آگے ایس سی اور جے سی کے لڑکے کسی کو گھاس ہی نہیں ڈالتے اور وہ تھی کہ کبھی ادھر کھڑی مٹک رہی ہے اور کبھی ادھر۔ استانیوں کی اس قدر منھ چڑھی تھی کہ ہمیشہ فارم کیپٹن وہی بنائی جاتی' والی بال کی ٹیم اس کے بغیر کھیل ہی نہ پاتی' اور ڈرامٹک سوسائٹی کا تصور ہی اس کے بغیر ناممکن تھا۔ چھوٹی کلاسوں کی بچیوں کو اس پر ہمیشہ یہ شبہ رہا کہ وہ یہ سب حرکتیں محض شو آف کے لیے کرتی ہے اور صرف ان کو جلانے کے لیے۔ اور اسی لیے جب جب چیپل میں بھجن گانے کے واسطے جاتیں تو سرخ رنگ کی گول گول گدیوں پر دوزانو بیٹھ کر دعا مانگتیں:

''یا اللہ پامیلا روتھ جلدی سے پاس ہو کر اسکول چھوڑ جائے۔''

''دیکھ لینا اگر یہ ایسے ہی جوزف سرل کے ساتھ گھومتی رہی' تو پھر اس کے پاس بے بی آ جائے گا'' بہت ہی پکی آواز اور بوڑھی سی شکل والی رخسانہ نے وثوق سے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' تقریباً سب نے سوال کیا۔

''بس ایسے ہی مجھے سب معلوم ہے۔'' اس نے آنکھیں مٹکائیں۔

''ارے ہاں واقعی!'' قارق خوشی کے مارے دیوانہ ہوگیا' پھر یہ اپنے بے بی کو سائیکل کے کیریئر سے باندھ کر لایا کرے گی' وہ تو سب بچوں کا بے بی ہوگا نا۔''

موزوں والی لڑکی نے ٹوکا۔ ''چلو ہٹو پاگل کہیں کے بے بی ایسے تھوڑی آ جاتا ہے' وہ تو شادی ہو کر آتا ہے۔'' لڑکیاں لڑکوں سے

کہیں زیادہ پختہ کار تھیں' ایس سی اور جے سی کی لڑکیوں کو دلی خوشی تھی کہ پامیلا روتھ اتنی لوفر نکلی ان کی تو گویا عید آ گئی تھی اور اب وہ اس کے اردگرد منڈلانے والے لڑکوں کی طرف دیکھ دیکھ کر اونچی آوازوں میں کہہ رہی تھیں: ''ہاں بھئی اس کو تو سب ہی اچھا سمجھتے تھے۔''

اپنی کلاس بھر میں سب لڑکوں سے اونچی اور مرکھنی سی بھی اپنے کلاس کے لڑکوں کو دل بھر کے چڑا رہی تھی ''تم بھی تو مرتے تھے پامیلا پر۔'' آج وہ سب دنوں کا بدلہ ان بدمعاشوں سے لے رہی تھی۔

انہوں نے پہلے تو بہلا پھسلا کر اس سے اس کے منگیتر کا نام پوچھ لیا تھا اور پھر اس کو اس قدر چڑایا کہ اس نے غصے میں آ کر اپنا ڈرائنگ بورڈ ڈالا۔ اور جیسے ہی ڈرائنگ بورڈ ٹوٹا سب کے سب چاقو اور بلیڈ لے کر اس کے ٹکڑوں پر پل پڑے جیسے کوئی ورکشاپ کھل گئی ہو اور دیکھتے دیکھتے ان ٹکڑوں کے خوبصورت اور چمکتے خنجر اور بوم رینگ تیار کر لیے' اور اس کو دکھا دکھا کر خوب رلایا۔

خیر ایس سی اور جے سی کے لڑکوں کا معاملہ تو صاف تھا' ظاہر ہے کہ جب پامیلا روتھ اپنے اسکول کے ڈان ژواں لڑکوں کو تو لفٹ نہ دے اور بھاگی پھرے سینٹ فرانسس کے ٹیڈی بوائے جوزف سرل کے پیچھے تو پھر غصہ تو آنا ہی تھا۔ نفرت اور انتقام ان کے سبزہ آغاز نوخیز چہروں پر بلیک بورڈ کی تحریر کی طرح روشن نظر آ رہا تھا' بچاری مس ایشلے! ''چچ' جس قدر وہ اسکول کے پیچھے جان مارتی ہیں اسی قدر ان کے اسکول کی انسلٹ ہوتی ہے سینٹ فرانسس والوں کے ہاتھوں۔''

وہ اس کو قریب سے گزرتا دیکھ کر جان بوجھ کر اونچی آواز سے کہتے کہ اس کی رگ حمیت بھڑک جائے۔

اور ہوا بھی یوں ہی پتھر کی ترشی ہوئی مورت کے سے چہرے اور سفید بالوں والی لمبی تڑنگی مس ایشلے نے تین دن تک پامیلا روتھ کی افواہوں کو سن کر ضبط کی انتہائی کوشش کی اور چوتھے دن اپنی سن بتیس کے ماڈل کی فورڈ سنبھالی اور دھڑ دھڑاتی ہوئی سینٹ فرانسس کے پورچ میں جا رکی۔

فادر میکفرسن کے انتہائی بااخلاق خیر مقدم کے باوجود مس ایشلے کی تیوریاں چڑھی رہیں اور انہوں نے فادر کے دفتر کی لمبی چوڑی میز کے دوسرے سرے والی کرسی پر اپنے آپ کو پٹخ کر بلا تمہید کے کہنا شروع کیا۔

''میں کہتی ہوں کہ اس کا کیا مطلب ہے؟''

''کس بات کا؟'' فادر میکفرسن نے آئرش آنکھوں کا تقدس سنبھالتے ہوئے مس ایشلے کی طرف دیکھا۔

''یہی کہ تمہارے اسکول کے لوفر لڑکے۔۔۔۔۔۔!''

''مس ایشلے' تمہارا اس سے کیا مطلب ہے؟'' فادر میکفرسن نے رعب سے بات کی۔ ''یعنی میرے اسکول کے لوفر لڑکے؟''

''میرا اس سے یہی مطلب ہے جو ہو سکتا ہے۔''

''یعنی؟''

''یعنی یہ کہ بے شک تمہارے اسکول کے لوفر لڑکے خصوصاً جوزف سرل!''

''جوزف سرل؟ میں نے ایسا کوئی نام اپنے اسکول میں نہیں سنا۔'' فادر میکفرسن نے غائب دماغی سے کہا۔

''ضرور سنا ہے' تم مکر کر رہے ہو' جوزف سرل تمہارا' میرا مطلب ہے تمہارے اسکول کا لڑکا ہے۔''

''تو پھر کیا حرج ہے' میرے اسکول میں اس وقت تقریباً آٹھ سو لڑکے ہیں۔ اگر جوزف سرل ہے تو تمہارا کیا لیتا ہے۔''

''اوہ مائی! یہ رومن کیتھولک!'' وہ آہستہ سے بڑبڑائی اور پھر وہ اونچی آواز سے بولی۔

''یقیناً جوزف سرل پر مجھے سخت اعتراض ہے اس لیے کہ وہ میرے اسکول کی پامیلا روتھ کو لیے پھرتا ہے اس کا جواب تم کو دینا پڑے گا۔''

''میں نے جوزف سرل کو یقیناً یہ مشورہ نہیں دیا تھا کہ وہ تمہاری پامیلا کو لیے پھرے۔''

''مگر میں کیا کروں؟ میرا اسکول جو بدنام ہو رہا ہے۔''

''تم اس کو رسٹکیٹ کر دو!''

''یہ بس یہی تو چال ہے تمہاری تم ہمیشہ میری بہترین لڑکیوں سے جلتے ہو' یہی تو تم چاہتے ہو کہ میں اس کو اسکول سے نکال دوں' یہ تم ہی اپنے لڑکے ان کے پیچھے لگاتے ہو۔''

''میں نے ایسی کبھی کوئی چال نہیں چلی۔'' فادر میکفرسن نے سکون سے کاغذوں کے پلندے پر دستخط کرتے ہوئے کہا۔

''قطعی! تمہارے اسکول میں اس کے مقابلے کا ایک بھی لڑکا نہیں ہے۔ تم کو خوف ہے اس مرتبہ ایس سی میں ٹوپ پر میرے اسکول کو رزلٹ رہے گا۔''

''ہونہہ! یہ تمہارا خیال ہے۔'' فادر میکفرسن حقارت سے مسکرایا۔ ''میں اپنے لڑکوں کو خوب جانتا ہوں اور تم کو بھی خوب معلوم ہے کہ تمہارے اسکول نے ہمیشہ میرے بچوں سے مات کھائی ہے' مگر خیر یہ کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے۔''

میکفرسن کھڑا ہو گیا' اس نے اپنے سفید چوغے کی ہری پٹی درست کی اور اپنی گھڑی دیکھی۔

''مگر تم کو میری بات کا جواب دینا ہی ہوگا۔''

''کیا جواب؟''

''یہی کہ جوزف سرل کا انتظام کرو۔''

''میں اس کو باندھ کر نہیں رکھ سکتا۔'' وہ باہر جانے کے لیے مڑا۔

''یہ بڑے شرم کی بات ہے۔'' ایشلے بھی غصلے سے کرسی دھکیل کر کھڑی ہوگئی۔

میکفرسن باہر جاتے جاتے گھوم کر ایشلے سے مخاطب ہوا:

''اگر میری بات مانو مس ایشلے' تو دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو' دونوں ہی اس سال ایس سی کے امتحان میں بیٹھ رہے ہیں اور خود ہی اسکولوں سے نکل جائیں گے۔''

''مگر پامیلا روتھ پروٹسٹنٹ ہے اور تمہارا سرل کیتھولک تم کو یاد رکھنا چاہئے ہمارا تعلق چرچ آف انگلینڈ سے ہے اور تمہارا روم سے۔''

''یہ صحیح ہے مس ایشلے'' میکفرسن چکرا کر بیٹھ گیا۔ ''لیکن اگر سچ پوچھو تو یہ ہمارے اور تمہارے سوچنے کے بجائے خود ان کے سوچنے کی باتیں ہیں۔''

''لیکن اس کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے اور پھر میں کہوں گی کہ تمہارے لڑکے نے ہماری لڑکی کو ورغلا رکھا ہے ایسا کہ وہ عقیدے کا فرق بھی بھول گئی ہے۔''

''معاف کرنا یہ میرے لڑکے کا قصور نہیں ہے' قصور اس تمہاری ڈیکنز کا ہے۔ اس نے کیوں نہیں پامیلا کو اس طرح پر سمجھایا کہ وہ اپنی زندگی کے اس پہلے رومانس سے دست بردار ہو جائے۔'' یہ کہتے کہتے میکفرسن کے آتش نقوش افسردہ ہو گئے اور اس کی سفیدی مائل سرخ ڈاڑھی آہستہ آہستہ تاسف سے ہلی اور اس کی آوازیں نکلی جیسے وہ میلوں کے فاصلے سے بول رہا ہو۔

''ہاں اس پچاس سالہ زندگی میں میں نے کتنے ہی واقعات ایسے دیکھے ہیں جب دو نوعمر محبت کرنے والے دلوں نے محض اپنے عقیدوں کی بنا پر اپنی زندگیوں کے رخ یکسر بدل دیے ہیں۔'' یہ کہتے کہتے میکفرسن مس ایشلے سے مخاطب ہوا' سنا مس ایشلے تم اپنی ڈیکنز سے کہو کہ وہ پامیلا روتھ کو سمجھائے۔ وہ اس کو مقدس مال کا واسطہ دے کر اس بات پر راضی کرلے کہ وہ اپنے چرچ سے باہر محبت نہ کرے' ڈیکنز کی بات بہت پر اثر ہوتی ہے۔''

مس ایشلے کو خواہ مخواہ ہی یہ شک سا ہوا جیسے فادر میکفرسن یہ بات بڑے طنز سے کہہ رہا ہو' ایک زیر لب تلخ تبسم کے ساتھ' یہ فقرے

اس نے ادا کیے ہوں۔

''فادر میکفرسن' تم تو مذہبی آدمی ہو کیا تمہارا یہ عقیدہ نہیں کہ لڑکے لڑکیوں کو اپنے چرچ سے باہر محبت اور شادی نہیں کرنا چاہیے۔''

فادر میکفرسن پھر اٹھ کھڑا ہوا ''میں! میری بات چھوڑو میں ایک راہب ہوں۔''

مس ایشلے کو پھر شک گزرا کہ وہ پھر ایک طنزیہ خندہ زیر لب کے ساتھ یہ بات اس کے گوش گزار کر رہا ہے۔

''تو کیا تم جوزف سرل کو بھی یہ بات سمجھاؤ گے؟'' مس ایشلے نے سوال کیا۔

''اگر تم پامیلا روتھ کو سمجھا لو' تو جوزف سرل کو سمجھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

مس ایشلے پھر بھڑک اٹھی۔ ''یہ کیا بات ہے تم اپنے لڑکوں کو تو کسی بات پر مجبور کرنا ہی نہیں چاہتے' میں ہی ہر بار اپنی لڑکیوں کو دباتی ہوں۔''

''مت دباؤ' یہ تمہاری اپنی مرضی ہے لیکن مس ایشلے اگر تم میری بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرو تو یہ ایک حقیقت ہے کہ لڑکی اگر ارادہ کرے اور وہ کسی بھی بات کی خاطر اپنی محبت کی قربانی پر تیار ہو جائے تو لڑکے کی مجال نہیں کہ وہ اس کو ورغلائے یا اس کا عہد توڑنے پر مجبور کر سکے۔''

''مس ایشلے تم نہیں جانتی ہو' لڑکے اس معاملے میں بہت بے بس اور بہت حقیر ہوتے ہیں۔'' یہ کہتے کہتے ایک بار پھر میکفرسن کی آئرش آنکھیں دھندلا سی گئیں' اس کے پتلے یاقوتی لب ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے اور مس ایشلے کو فضول ہی شک سا ہونے لگا کہ ایک بڑی ٹھنڈی اور گہری سانس فادر میکفرسن کے چوڑے چکلے سینے میں بے تاب ہے۔

وہ جھکا اور بڑے اخلاق سے بولا:

''اب مجھے اجازت ہے؟ مجھے ایس سی کی کلاس لینے جانا ہے' مس ایشلے یوں فکر کرنے کی ضرورت نہیں' محبت کو اس دنیا میں ایک بہت ہی کم ہمت اور بے حقیقت جذبہ سمجھا جاتا رہا ہے' وقت اور مصلحت کے تقاضوں کی قربان گاہ پر اس کو ہمیشہ بھینٹ چڑھایا جاتا رہا ہے' مجھے امید ہے تمہاری پامیلا روتھ بھی سمجھ داری کا ثبوت دے گی' اپنا راستہ بدل دے گی اور تمام عمر کے لیے بھول جائے گی کہ اس کا پہلا یا پھر پہلا اور آخری رومانس ایک لغزش محض تھا۔''

''اوہ بھول جائے گی! بھول جائے گی!'' مس ایشلے کا بوڑھا دل دھڑکا ''کیا بکواس کرتے ہو فادر میکفرسن۔'' جیسے اس کا دل پکار اٹھا' لیکن کمرے میں خاموش تھی اور کوئی بھی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔

فادر میکفرسن برآمدے میں جاتے جاتے مڑا۔ اور خوش دلی سے بولا:

''مس ایشلے میرا ایک کام کر سکتی ہو۔''

''کیا کام؟'' وہ بھی اخلاق برتنے پر مجبور تھی۔

''اپنے خانساماں سے کہو وہ میرے خانساماں کو آئرش سوپ بنانا سکھا دے۔''

''ہاں کیوں نہیں' مگر تمہارا خانساماں تو بہت اچھا سوپ بناتا ہے۔''

''وہ پرانا خانساماں آئرش تو مر گیا نا' یہ ایک نیا آدمی ہے اور بس واجبی ہی سا پکانا آتا ہے اس کو۔''

''اچھا تو پھر کل اس کو بھیج دینا۔'' مس ایشلے نے مستعدی سے کہا ''میں خود اس کو سکھا دوں گی۔'' وہ سارا جھگڑا تو ختم ہو ہی چکا تھا۔

''شکریہ!'' فادر بچوں کی طرح مسکرایا۔ ''وہ! بات یہ ہے کہ کبھی کبھی گھر کا سا کھانا کھانے کو بہت دل چاہتا ہے' اور تم جانو'' وہ بالکل نوعمر لڑکوں کی طرح شرما کر بولا ''مجھے خانہ داری کی باتوں میں قطعی دخل نہیں۔۔۔۔۔۔۔ بھئی یہ کام تو عورتوں کے ہوئے نا۔'' عمر رسیدہ فادر اس وقت ایک چھوٹے سے لڑکے کی طرح بے بس اور بے ڈھنگا نظر آ رہا تھا ''اچھا خدا حافظ۔''

''پامیلا روتھ! پامیلا روتھ!'' اوہ صبح سے شام تک پامیلا روتھ سن سن کر کان پک گئے' جتنا ٹالا اسی قدر یہ قصہ بڑھ بڑھ کر کانوں سے ٹکراتا ہے' دراز قد' چھریرے جسم' موتی کے سے ترشے ہوئے چہرے اور سفید بالوں والی مس ایشلے نے اپنے مختصر سے گوتھک طرز کے بنے ہوئے سال خوردہ بنگلے کی دیوار سے ٹیک لگا کر سوچا' وہ اب تک پامیلا کے اسکینڈل کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی' کوئی اقدام نہ لے سکی تھی۔

فرانسیسی جالیوں والے مغربی دریچوں پر آئیوی کی نازک لیکن مضبوط بیل بڑی خواب ناک افسردگی سے پھیل ہوئی تھی۔ برآمدے میں سیاہ آبنوسی لکڑی کے ہیٹ ریک پر ایک بڑا سا ہیٹ اور کئی نازک نازک سی چاندی کی شام والی چھڑیاں ٹنگی ہوئی تھیں' برآمدے کے دروں اور سیڑھیوں پر پام اور نادر قسم کے کروٹن کے لاتعداد گملے رکھے تھے' اور دروں کی محرابوں سے لوبنا کی خوبصورت بیل کی کونڈیاں لٹک رہی تھیں' سرخ بید کی آرام کرسیوں کے درمیان ان کا کوک اسپینیل گڑمڑی مارے سو رہا تھا۔

اندر نشست گاہ میں تیز رنگ اور زرد پھولوں والے قالین پر وکٹورین طرز کا آبنوسی فرنیچر سجا ہوا تھا' کونوں میں اونچے اسٹینڈوں پر پیتل کے گملوں میں ناگ پھنی اور ایسٹرلٹی کے گملے اترے ہوئے تھے' دریچوں اور دروازوں پر نفیس اور نازک لیس کے کافوری پردے افسردگی سے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

مینٹل پیس پر چھوٹے چھوٹے نوادرات کے عین وسط میں اخروٹ کے منقش بیضوی فریم میں ایک لڑکی کا شوخ و گستاخ چہرہ مسکرا رہا تھا' یہی پامیلا روتھ کی سی عمر' کھلی کھلی سبزی مائل آنکھیں اور چسٹ نٹ کے رنگ کے نرم نرم بال شانوں تک آئے ہوئے اور یہ تھی اس کی یعنی ہیزل ایشلے کے لڑکپن کی تصویر' نادانیوں اور طراریوں کے عہد کی تصویر۔

کھانے والے کمرے میں کروشیا کے میز پوش سے ڈھکی ہوئی قدیم طرز کی بھاری اور بیضوی میز کے وسط میں فوری گلاب کے نیم شگفتہ غنچوں سے بھرا ہوا سچی چینی کا نیلا گل دان تھا' اور اس کے سرے پر بوڑھی ہیزل ایشلے کا لنچ منتظر تھا۔ بھاری اور منقش سلور کی کٹلری کا ایک سیٹ اور بہترین چائنا کراکری کی صرف ایک پلیٹ' گلاس میں پھولوں کی طرح سجا ہوا نفیس نیپکن یہ تمام چیزیں تقریباً تیس سال سے ہر روز عین اسی وقت اس کی منتظر ہوئی تھیں۔ ہر روز وہ یہاں اسی بھاری اور قدیم منبر کے سرے پر تنہا بیٹھ کر بڑی اشتہا اور کروفر سے اپنا لنچ کھاتی تھی۔

مگر آج وہ یعنی بوڑھی ہیزل ایشلے یہاں بنگلے کی کائی خوردہ سبزی مائل دیوار سے بچوں کی طرح پیٹھ لگائے کھڑی تھی' وہ چونکی اور آہستہ آہستہ اندر آ گئی' چھت کا پنکھا اس کے انتظار میں ایک خاص رفتار سے دھیرے دھیرے چل رہا تھا کمرے کی خواب ناک خنکی نے راحت کے احساس کے ساتھ اس کو افسردگی کا احساس بھی دلایا۔ آبنوسی رنگت والی موٹی بھدی اور اجلی ساڑھی والی آیا نے پردے کے پیچھے سے جھانک کر اطلاع دی' مس صاحب حاضری!

''تو حاضری' ہم آج لنچ نہیں کھانا مانگتا'' ایشلے نے بڑی نرمی سے کہا۔

''تو میم صاحب کا پی لاؤں (کافی لاؤں)؟''

''ہاں لے آؤ۔''

گرم گرم خوشبودار کافی کی پیالی میں سے اٹھتی ہوئی بھاپوں کے درمیان ہیزل ایشلے کا ماضی اس کے سامنے ابھرتا چلا آیا' وہ ماضی جس کو اس نے پینتیس سال قبل مصلحت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا کر وقت کے گہرے گڑھے کے نیچے دفن کر دیا تھا۔

واقعی فادر میکفرسن' کیسی غلط بکواس کر رہا تھا کہ پامیلا روتھ تمام عمر کے لیے بھول جائے گی کہ اس کا پہلا اور آخری رومانس ایک لغزش محض تھا۔''

کیا ایسی کوئی بات بھی ممکن ہو سکتی ہے' انسان اپنے صالح عمل تو کر کے بھول بھی سکتا ہے' لیکن زندگی کی لغزشوں کو کون بھلایا کرتا ہے' اگر یہ ممکن ہوتا تو کیا وہ خود یعنی ہیزل ایشلے اپنے پہلے اور آخری رومانس کو نہ بھول جاتی' بالکل پہلا۔ پامیلا روتھ کا سا کیس تھا اس کا

بھی۔ بالکل ایسی ہی باؤلی سی عمر تھی اس کی اور وہ عجیب وغریب لڑکا کرسٹوفر جس کو وہ پیار میں کرس کہا کرتی تھی وہ بھی تو اسی رومن کیتھولک فرقے سے تعلق رکھتا تھا اور جب ان دونوں کے رومانس کا انکشاف ہوا تو کتنی ناگواری پھیلی تھی اسکول میں بھی اور دونوں گھرانوں میں بھی۔۔۔۔۔۔۔اف توبہ اس کا تو خیال کر کے ہی اس کا دل گھبرانے لگتا تھا اب تک' بلکہ اب اس وقت کے تیس پینتیس سال بعد شاید یہ انکشاف لوگوں کو اتنا سنگین نظر نہ آئے کہ چرچ آف انگلینڈ سے تعلق رکھنے والی پامیلا روتھ کا بوائے فرینڈ جوزف سرل ہے' پھر جب اس کو ڈیکنز کے روبرو بھیجا گیا تھا تو وہ کتنی خوف زدہ اور سراسیمہ تھی۔ اس خیال سے اس وقت بھی ہیزل ایشلے کی بوڑھی روح لرز اٹھی تھی۔۔۔۔۔۔۔ایک ہفتے تک ڈیکنز نے اس کو اپنی نگرانی میں رکھا اور دن رات اس کو سمجھایا جس کا نتیجہ یوں ظاہر ہوا کہ ہفتے کی رات کو بڑی بڑی شوخ آنکھوں اور سرکش مزاج والی ہیزل ایشلے نے فیصلہ کر لیا۔

''اچھا بھئی ڈیکنز جو تم کہو وہی تم کہو وہی ٹھیک ہے بہت ممکن ہے میں ہی غلطی پر ہوں اور جب معاملہ شک کی نوبت اختیار کر لے تو پھر غلط اور صحیح کی ذمہ داری بہتر ہے کہ تمہاری ہی گردن پر رہے' تم ڈیکنز ہو اور تم کو ہماری محافظت پر مامور کیا گیا ہے' بس اب ٹھیک ہے' اب کل سے تم کلاس میں اسکپر یچر پڑھاتے وقت خاص خاص موقعوں پر میری طرف معنی خیز نظروں سے نہ دیکھنا۔''

اور پھر اتوار کی صبح کو اس نے اچھی لڑکیوں کی طرح ڈیکنز کے سامنے اقرار کر لیا تھا کہ اب وہ زندگی میں کتابی کو تو اہمیت دے گی' مگر نہیں دے گی تو کرس کو جو بہت عجیب وغریب سا لڑکا ہے جس کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی ہے اور جس پر اس کو پیار ہی صرف اس لیے آیا کرتا ہے کہ اس کی صورت شکل سے لے کر ہر بات اور ہر حرکت عجیب اور ناقابل فہم ہے اور یہ کہ میرا وعدہ اور ارادہ اٹل ہے۔

اور کرس اتنا گڈ بوائے نکلا کہ فوراً اس کے راستے سے سر جھکائے ہٹ گیا۔ اونہہ کم بخت یہی تو بات رہ رہ کر اس کے دل میں آج تک کھٹکتی ہے کاش وہ اس کو برا بھلا کہتا' بے وفا اور دھوکے باز کہتا' لڑتا یا ٹھنڈی آہیں بھرتا' بس وہ تو مسکرایا' دو قدم پیچھے ہٹا' اٹن شن ہو کر ایک فوجی سلیوٹ مارا اور اباؤٹ ٹرن ہو گیا۔

اور ہیزل ایشلے کی باقی کی زندگی کا کیا چوچھنا۔ اچھی بیٹی نے خوب پڑھا خوب لکھا اور ایک دن یہاں آ کر اس اسکول کی باگ ڈور سنبھال لی۔ اس لیے کہ پہلی پرنسپل مس وڈس اچانک ہی دل کی حرکت بند ہو جانے سے ختم ہو گئی تھی۔

پچیس طویل سال اس نے اس گرم اور اجنبی ملک میں ہنس کھیل کر گزار دیے' ایک بالکل اجنبی اور غیر قوم کے بچوں کی تعلیم اور بہبودی کے خاطر وہ گھنٹوں فائلوں اور کاغذوں سے سر مارتی' محکموں اور دفتروں کے چکر لگاتی۔ ایک ایک بچے لانگ جمپ اور ڈسکس تھرو میں چیمپئن شپ جیتتے تو وہ دو دو ہاتھ اچھل کر تالیاں بجاتی۔ اس کے اسکول کی لڑکیوں اور لڑکوں کی ٹیم مباحثوں سے شیلڈیں جیت

کرلاتی اور اس کے حوالے کرتی تو فرط مسرت سے اس کے ہاتھ لرزنے لگتے اور آنکھوں کے گوشے نم ناک ہو جاتے۔

وہ ہر سال جب سالانہ جلسے میں تقسیم انعامات کے علاوہ اپنے فارغ التحصیل بچوں کو ایس سی کے سرٹیفکیٹ دیتی تو اس کی پلکوں پر ستارے سے لرزنے لگتے۔ طلبائے قدیم کی ریلی میں ہر سال جب اس کے شاگرد جمع ہوتے' تو وہ اپنے بچوں اور بچیوں کو دیکھ کر فخر اور مسرت سے دیوانی ہو جاتی۔ سب شاد آباد خوش خرم اور مگن ہیں اور یہ سب اسی کے ہاتھوں کی سینچی ہوئی پھلواری کے پھل پھول ہی تو تھے۔

شہر میں اس کے اسکول کی ٹکر کا صرف ایک ہی اسکول تھا۔ کیتھولک چرچ کا سینٹ فرانسس اسکول' فادر میکفرسن بھی تقریباً اتنی ہی مدت سے اس میں اپنی جان اور اپنا وقت کھپا رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اور وہ ہی اس کا صحیح معنوں میں ہر پہلو سے رقیب تھا۔

یہ نوجوان آئرش پادری بھی انھی دنوں یہاں آیا تھا جن دنوں مس ہیزل ایشلے یہاں پہنچی تھی۔ سنا تھا کہ وہ بھی اسی کی طرح خود اپنی مرضی سے اس جگہ سینٹ فرانسس کی پرنسپل شپ سنبھالنے آیا تھا۔ فادر میکفرسن اور ہیزل ایشلے نے جلاوطنی کے یہ پچیس تیس سال ایک دوسرے کا مدمقابل اور حریف بن کر گزارے تھے' وہ چاہے کھیل کا میدان ہو یا امتحان کا نتیجہ' ڈرامے ہوں یا مباحثے جب کسی ایک کے اسکول کا پلہ بھاری ہوتا تو وہ دوسرے کی طرف بڑے غرور اور طنز سے دیکھتا' اور یوں یہ چوتھائی صدی ایک دوسرے کی ضد اور رقابت میں گزر گئی۔ لیکن ان میں سے ایک نے بھی ایک دوسرے سے کبھی یہ پوچھنے کی تکلیف گوارا نہ کی کہ آخر مجاہدہ نفس کی کس کٹھن منزل کو سر کرنے کی خاطر تم یہاں پڑے ہو' تم نے مصلحت اور زمانے سے وہ کون سا گراں قدر سودا کیا تھا جس کی ادائیگی یوں کر رہے ہو اور اس سودے میں تم گھاٹے میں رہے یا نفعے میں۔ بوڑھی ایشلے نے کافی کی سرد پیالی اٹھا کر ایک طرف رکھتے ہوئے سوچا نوعمر ہیزل ایشلے نے ڈیکنز یا اپنے عقیدے سے جو بیوپار کیا تھا اس میں نقصان ہوا یا نفع' یہ آج تک طے نہ ہو سکا۔

ایئر فرانس کا طیارہ آمادہ پرواز تھا اور دیس دیس کے مسافر جلد جلد قدم بڑھاتے طیارے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بے حد چاق چوبند بے حد اسمارٹ سفید سر والی ہیزل ایشلے سے چند قدم پیچھے ایک اور ہستی بھی تھی جو اسی کی طرح اپنی خدمات پوری کر کے اس سر زمین سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے واپس جا رہی تھی اور یہ تھا کیتھولک چرچ کا بوڑھا آئرش فادر میکفرسن۔ اس کے برف جیسے سفید لبادے کی چوڑی سی سبز پٹی ہمیشہ سے زیادہ خوبصورتی سے بندھی تھی' اس کے ہاتھ میں بھی ایئر فرانس کا ویسا ہی سفری تھیلا تھا اور آنکھوں میں ویسی ہی طمانیت۔

''اوہ ہلو فادر میکفرسن'' ہیزل ایشلے پھرتی سے مڑی۔

اور فادر میکفرسن نے جلدی کے باوجود احتراماً ہیٹ اتار کر سر جھکا دیا۔

''کیا تم فرلو پر جا رہے ہو؟''

نہیں میری سروس کی مدت پوری ہو گئی' اور تم کیا فرلو پر جا رہی ہو' مس ایشلے؟''

''میرا بھی کام ختم ہو گیا۔''

فادر میکفرسن معنی خیزی سے مسکرایا' جیسے کہتا ہو میرا اور تمہارا جھگڑا بھی ختم ہو گیا اب میرے اور تمہارے درمیان پامیلا روتھ اور جوزف سرل کے رومانس جیسے متنازعہ فیہ واقعات بھی ختم ہو گئے۔

ان دونوں کا سامان مختصر تھا' دونوں ہی کے سامان میں ایک چھوٹا سا بکس محبت بھرے عقیدت مندانہ تحفوں سے بھرا ہوا تھا' ان کی نشانیاں جن کے لیے انہوں نے اپنی زندگیاں تج رکھی تھیں۔

ایئر ہوسٹس نے مسافروں سے بیلٹ باندھنے کو کہا اور جہاز نے ٹیک آف کیا' ایک دوسرے کے برابر والی کرسیوں پر بیٹھے فادر اور مس ایشلے نے آخری بار جھک کر اس شہر کی سرزمین کو دیکھا جہاں انہوں نے اپنی زندگی کی چوتھائی صدی بڑی دھوم دھام سے گزاری تھی۔

ایئر فرانسس کا طیارہ نیلگوں فضا کی وسعتوں کو چیرتا ہوا اوپر اٹھتا چلا جا رہا تھا نیچے بالشتیوں کی دنیا تھی ننھے ننھے گھروندے بڑے پرسکون نظر آ رہے تھے ان میں سے بے شمار گھروندے ان کے ہوں گے جن کو ہم نے پڑھایا ہے اور جن کے مسائل پر اپنا خون جلایا ہے۔

دونوں کی نظروں نے ایک بار جھک کر پھر زمین کی پستیوں کو چوما' اور یوں معلوم ہوا جیسے نیلگوں آسمان کی بے کراں وسعتوں سے دو مختلف خداؤں نے جھک کر اپنی کائنات اور مخلوق کو جھانکا ہو۔

◆◆◆

اک شور ماومن

یہ صبح تمام رات بھیگتی رہی تھی۔

اور جو سحر تمام شب بھیگتی رہی ہو' جن اجالوں کے پیش رو اندھیرے کی چھاتی پر بجلی کے کوندے تڑپ تڑپ کر جگمگائے ہوں' جس ہنگام سحر کے نقیب سناٹوں پر بادل گرج گرج کر برسے ہوں۔

ایسی سحر کو کیا کہیے۔

اور اس کی پیش رو رات کے اندھیروں میں میں نے وہ خواب دیکھا۔ مگر خوابوں کا دیکھنا کچھ اچھی علامت نہیں' خواب تو ہمیں سرگرداں کر دیتے ہیں۔

انسان نے عہد قدیم سے اپنے اچھے خوابوں کی پاداش میں سختی سہی ہے۔ جب انسان ستاروں اور سورج چاند کو اپنے آگے سربسجود ہوتے دیکھتا ہے تو اندھیرے کنویں اس کا مقسوم بنتے ہیں۔

اس علم کے باوجود میں نے تمام رات وہ خواب دیکھا حالانکہ میں اس تمام رات نیم خوابی کے عالم میں رہا تھا' میرے کانوں میں بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک گونجتی رہی تھی اور آنکھوں میں وہ خواب براجتا رہا تھا۔

تب وہ سحر بند کواڑوں کے اس طرف مسکرائی اور سحر کی کیا مجال جو کسی کی پردہ پوشی کر سکے۔ اس کے حریری لبادے نے ہر روز کی طرح اس روز بھی تاریکی کا ہر راز فاش کیا۔ اور قصور تو میری کھڑکی کے میلے دھواں سے شیشوں کا تھا جو وہ ہنگام سحر دروازے کے اس طرف ہی ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔

مگر مجھے تو میرے خواب نے جگا دیا تھا۔

اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ خواب سوتے ہیں ہمارے پاس آتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ خواب ہی ایسے ہوں جن سے نیند گھبراتی ہو یا پھر یہ کہ ہم ان خوابوں کی عالم بیداری میں ہی دیکھنا چاہتے ہوں۔

میں نے اس خواب میں کیا دیکھا! یہ میں ہرگز نہیں بتا سکتا اس لئے کہ میں نے سنا ہے کہ خواب' بدخواہ' بدصورت اور کج فطرت انسان کے سامنے نہیں بیان کرنا چاہئے اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ کنعان کے بوڑھے پیغمبر نے اپنے بارھویں بیٹے کو منع کیا تھا کہ وہ اپنا

خواب اپنے گیارہ بھائیوں کو نہ سنائے اور یقیناً وہ گیارہ بھائی بدصورت اور کج فطرت نہ رہے ہوں گے۔ یہ محض ہمارے خواب ہیں جو دوسروں کو بدخو اور کج فطرت بنا دیتے ہیں۔

اور یہ بھی سچ ہے کہ انسان کو اس کے اچھے اور برے دونوں ہی خواب سرگرداں رکھتے ہیں۔

میں اپنا خواب کسی کو نہیں سناؤں گا۔

اور اب مجھے دفتر جانا ہے۔

تمام راستے سڑکوں اور شاہراہوں نے گھوم گھوم کر مجھے پکارا ہے' آؤ! تم ہمیں اپنا خواب سناؤ۔

پتھروں اور تارکول کی سختیوں اور سنگینیوں اور سہمی' تڑختی ہوئی دھوپ میں چٹختی اور پیٹا پیٹ بارشوں میں بھیگتی سڑک کسی کی بدخواہ نہیں ہو سکتی' وہ سب کے قدموں تلے بچھ بچھ جاتی ہے' کیا میں اپنا خواب اس کے آگے بیان کر دوں۔

ایک یہ بھی تو مصیبت ہے ہمارے اندر باتیں پہنچتی بھی تو نہیں۔ یہ انسان کا اندر بھی کیسا بے برداشت اور بے ظرف ہوتا ہے۔ اتنی سی ذرہ برابر پھانس کو بھی تو اپنے آپ میں سنبھال کر نہیں رکھ پاتا۔ جو سوئی لے کر کریدنے سے بھی اسے نہیں نکال پاتا' تو پھر وہ مواد بن کر پک کر پھوٹتا اور اور وہ ذرہ سی رفیق بھی پھانس بھی مواد کے ریلے میں بہ جاتی ہے۔

اور اب یہ پک کر پھوٹنے کی بات پر مجھے یہ بھی دھیان آیا ہے کہ میں اپنے آپ خواب کو اپنے ضمیر کے بطن میں اتنی مدت ضرور محفوظ رکھوں گا کہ وہ پک کر خود بخود پھوٹ نکلے۔

یہ کام کا وقت ہے اور میں ایک وہمی عورت کی طرح اپنے خواب کی ادھیڑ بن میں مصروف ہوں اور یہ کوئی نیا خواب تو نہیں جو میں نے دیکھا ہے' میں نے سوتے اور جاگتے میں بارہا خواب دیکھے اور ان کے ہاتھوں سرگرداں بھی رہا ہوں۔

لیکن یہ خواب تو جیسے میرا پہلا پہلا خواب ہے یا پھر کیا بات ہے کہ میرا دل اپنے کام سے اچاٹ ہے۔

جب ہمارا دل اچاٹ ہوتا ہے تو ہم انتہائی غیر ضروری اور غیر اہم باتوں کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے سوچتے ہیں۔ مگر خواب کے بارے میں تو سنجیدگی سے فرعون نے بھی سوچا تھا اور اس نے اپنے تخت کے پائے کے ساتھ کھڑے تناور درخت سے گھبرا کر بنی اسرائیل کا بیج مار دینے کی ٹھان لی تھی۔ اس لئے کہ اس کو بتایا گیا تھا کہ تناور اور چھتنار درخت جمہور کی علامت ہوتے ہیں۔ پھر بھی مجھ میں اور فرعون میں بڑا فرق ہے وہ کاٹھ کے تخت پر بیٹھ کر خدائی کے دعوے اور فرمان جاری کرتا تھا اور اپنے موسیٰ کو خود اپنے ہاتھوں پروان چڑھا رہا تھا' اور میں Young ones (ینگ ونز) کے اس چھوٹے سے دفتر میں جس کرسی پر بیٹھا ہوں وہ نہ کاٹھ کی ہے اور

نہ میری اپنی ہے لوہے کی تین ٹانگوں پر کھڑی یہ کرسی مرئی پلاسٹک کی باریک باریک پٹیوں سے بنی ہوئی ہے' اور یہ بھی اس دفتر اور اس کی ہر شے کی طرح پیر انعام اللہ کی ملکیت ہے۔ میرا فرمان بجز اس دبلے پتلے پستہ قد تلوار جیسی مونچھوں والے ٹائپسٹ کے کسی دوسرے آدمی پر جاری ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ ٹائپ کے علاوہ پی این (Peon) اور ڈسپیچر کے فرائض بھی یہی خالد خاں ٹائپسٹ انجام دیتا ہے جس کو بیگم انعام اللہ از راہ کرم دوبارہ اپنی گاڑی میں بٹھا کر ٹی بی کلینک لے جا چکی ہیں اور ملٹی وٹامن گولیاں بھی مفت دلوا چکی ہیں۔

اور اب میں نے خالد خاں سے پوچھا ہے۔

خالد خاں تم کو خوابوں پر یقین ہے۔

جی وہ! میں! وہ گھگیا گیا (نہیں معلوم یہ کیوں ہمیشہ گھگیا جاتا ہے' مگر پہلے جب وہ اتنا کھانسا نہیں کرتا تھا تو یہ بات بھی نہ تھی)

وہ کہہ رہا ہے۔

''میں نے ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ پکا مکان بن رہا ہے۔ راج اور مستری اونچے اونچے مچانوں پر شور مچا رہے ہیں' اینٹ لاؤ' گارا لاؤ۔ اور میں ہر طرف اہتمام کرتا پھر رہا ہوں۔

اور میں نے جب یہ خواب مولوی صاحب کے سامنے بیان کیا تو وہ سر جھکا کر چپ ہو گئے۔

دوسرے دن والد صاحب فوت ہو گئے اور میں ان کے سوئم اور چالیسویں کی فاتحہ کے چکر میں مقروض ہو گیا۔

''کیا کہا؟'' میں چیخ پڑا ہوں' اتنی زور سے کہ خالہ خاں اچھل پڑا ہے۔ اس نے مجھے خوف زدہ نظروں سے دیکھا ہے'' ''تم نے پکا مکان بنتے دیکھا تو والد صاحب فوت ہو گئے؟''

''جی وہ پہلے سے بھی کچھ بیمار تھے' کھانستے رہتے تھے۔'' اس نے سر جھکا کر ٹائپ شدہ کاغذ سمیٹنا شروع کر دیئے' ''مگر میرا مطلب یہ ہے کہ کھانسی انہیں گلے سے آتی تھی۔''

خالد خاں! میں نے رعب سے اس کو مخاطب کیا ہے۔

یس سر!

تم کو کسی اور اچھے خواب کی بری تعبیر ملی ہے۔

سر مجھے خواب یاد نہیں رہتے اس نے نہایت عیاری سے سر جھکا کر بات ٹالی ہے اس طرح کہ مجھے آ گئی ہے' میں اس کا خواب

خوش سن کر رہوں گا جس کی تعبیر غلط ملی۔

دیکھو خالد خاں مجھے تمہارا خواب ابھی چاہئے' مجھے خوابوں کے بارے میں فیچر لکھنا ہے۔

میری آواز میں تحکم ہے اور میں کتنا جھوٹا ہوں۔ پیر انعام اللہ کی طرف سے مجھے سختی سے ہدایت ہے کہ (Young Ones) کو میں اپنی اور اپنے ہی جیسے دوسروں کی جولانی طبع کا میدان بنانے سے احتراز کروں کہ طبع زاد باتوں میں کئی قباحتیں بھی ہوتی ہیں۔ میں تو ذہنوں سے اترے پرانے اور فرسودہ ٹائم میگزین' لائف اور ریڈرس ڈائجسٹ کے دلچسپ اور محیر العقول مواد ہی کو بطور خود لکھنے کا مجاز ہوں' زاید اسی لئے خالد خان نے مجھے حیرت سے دیکھا ہے اور میرے بشرے پر بدستور قائم سختی کو دیکھ کر اب وہ اپنا ایک اور خواب بیان کرنے پر راضی ہو گیا ہے۔

پھر جناب میں نے خواب میں اپنی منجھلی بہن کو دلہن بنتے دیکھا تھا' تو جناب ایک ماہ بعد وہ فوت ہو گئی۔

ایک اور اچھے خواب کی بری تعبیر۔ مگر خالد خاں یہ تمہارے ہر خواب پر تمہارے گھرانے کے لوگ پٹ سے مر کیوں جاتے ہیں؟ میں نے اسے گھورا ہے۔

بس جی اتفاق ہے! اللہ کی قدرت ہے' اس کا منحنی اور پستہ وجود جیسے زمین میں گڑا جا رہا ہے' میں نے اس مرتبہ فال نامے میں دیکھا تھا اس میں یہی تعبیر تھی کہ جس کسی کو دولہا یا دلہن بنتے دیکھو تو یہ اس کی موت کی علامت ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم پشتینی بیماری میں مبتلا ہیں۔ خالد خاں مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہا ہے اور اس کا خوف اور شک بے سود ہے۔

میں پہلے ہی بیگم انعام اللہ سے کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس کے ساتھ بیٹھ کر کام کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔

البتہ وہ اکثر اپنے گھر کے اس دور افتادہ کمرے میں اس کو موجودگی کے خیال سے اکثر پریشان ہو جاتی ہیں۔

اور کوئی خواب!

اور خالد خاں نے اس کام کو بھی شاید منجملہ ٹائپسٹ پی ان (Peon) اور ڈسپیچر کی ڈیوٹی کے طور پر قبول کر لیا ہے اور وہ نہایت مستعدی سے خواب سنا رہا ہے۔ پھر میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مر گیا ہوں اور فال نامے میں موت دیکھنا شادی کی علامت ہے' تین ماہ بعد میری شادی ہو گئی اور چار سال میں جڑواں ملا کر پانچ بچے ہو چکے ہیں۔

عجب الٹے خواب دیکھتے ہو تم۔

خواب نہیں جی اس کی تعبیر الٹ ہوتی ہے' اس نے نہایت وثوق سے کہا۔

پھر میرے خواب کا کیا بنے گا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا ہے۔

جی آپ کا خواب؟

خالد خاں! میں نے رعب سے اس کو مخاطب کیا ہے۔

یس سر!

اس ماہ کا پرچہ تیس تاریخ کو مارکیٹ میں آ جانا چاہئے۔

خالد خاں تم مجھ سے میرا خواب نہیں اگلوا سکتے' میں نے سوچا ہے اور اپنے کاموں میں لگ گیا ہوں' میں یہاں سے اٹھوں گا تو مجھے مسعود مل جائے گا اور پھر وہ سے الٹی سیدھی باتیں کر کے مجھے بور بھی کرے گا اور اپنے کام سے بددل بھی۔

لیکن مسعود یہ کبھی نہیں سوچتا کہ میں پیر انعام اللہ کی اتنی طویل اور عریض اور اتنی خوب صورت کوٹھی کے آخری سرے پر بنے ہوئے اس چھوٹے اور نسبتاً گرم کمرے میں اپنی خوشی سے نہیں بیٹھا ہوں' اس کمرے میں جہاں پیر اور بیگم انعام اللہ کے سر میں Young Ones نکالنے کا سودا سمانے سے پہلے باغبانی کا فالتو سامان اور گھاس کاٹنے کی مشین رکھی جایا کرتی تھی' وہی شخص بیٹھنا پسند کرے گا جسے کچھ مجبوری لاحق ہوگی' اور میں نے تو سینئر کیمبرج تک کسی ایسی ویسی بات کے متعلق سوچا بھی نہ تھا کہ سینئر کیمرج کی وساطت سے تعلیم مکمل کرنے والوں کا مستقبل روشن اور مستحکم ہوتا ہے۔

لیکن یہ بھی ایک مجبوری ہی تھی کہ اگرچہ میں نے خالد خان کی طرح پکا مکان بنت خواب میں نہیں دیکھا تھا' لیکن پھر بھی! ابا جان پکا مکان بنواتے بنواتے فوت ہو گئے اور پھر مجھے اس منزل تک پہنچتے کئی سال لگ گئے اور سرکاری ملازمت میں عمر کی ایک خاص مدت مقرر ہے جس کے آگے وہ ایک لفظ سننے پر تیار نہیں ہوتے' آخر عمر کا بڑھ جانا کوئی جرم تو نہیں۔ مگر مجبوری شاید سب سے بڑا جرم ہے' جسے سننے کی کسے فرصت ہے۔ میں نے جانا تھا کہ چھوٹی موٹی ملازمتیں کر کے بہن بھائیوں کو پڑھوانے اور ان کا پیٹ بھرنے میں میرا وقار بہت بڑھ جائے گا اور میرا شمار غازیوں اور شہیدوں میں کیا جائے گا۔ لیکن میں غلطی پر تھا اور یہ میرا پہلا خواب تھا جس کی تعبیر الٹ ملی تھی۔ میرا وقار گرتا چلا گیا اور اب اس چھوٹے سے کیفے میں میں مسعود کے ساتھ نہ جائے رفتن اور نہ پائے ماندن کے عالم میں بیٹھا ہوں۔ مسعود تمہاری تخلیق اللہ تعالیٰ نے شاید میرے احساس اور جذبے کو مجروح کرنے ہی کے لئے کی تھی۔

مسعود ہنس رہا ہے۔

یہ تمہارے Young ones ایک محدود حلقے میں ہی چلے گا' تم اپنے عوام سے دور ہو' تمہاری تحریر اجنبی ہے تم دلدل میں قدم

جما کر کھڑے ہونا چاہتے ہو اور میرا دل چاہ رہا ہے مسعود کے منہ پر تھوک دوں' عوام! عوام نفرت ہو گئی عوام کے نعرے سے' عوام اور جمہور ہے کس بلا کا نام۔ عوام کدھر ہیں' جب ان میں سے ہر آدمی خاص الخاص بننے کی فکر میں ہے بجز جھلستی دوپہر میں سڑکوں پر کام کرنیوالے مزدوروں اور بے حد گھوم پھیر والے رنگ برنگی پھول دار لہنگے پہنے چاندی اور کانسی کے میلے میلے زیوروں میں لدی مزدورنیوں کے جو بڑی چونچالی اور مستعدی سے دوڑ دوڑ کر کام کرتی ہیں۔ ان کے قریب میری تحریر پہنچ رہی ہے اور نہ تمہاری' مسعود میاں میں اور تم ایک ہی کشتی میں سوار ہیں اور ایک ہی دلدل میں قدم جما رہے ہیں' تمہارا ادب یہ مزدور نہیں سمجھیں گے اور Yong Ones پڑھنے والے بھی نہیں سمجھیں گے اس لئے کہ ان کو تمہارے ادب سے ٹچ نہیں۔ میرا مطلب مس نہیں ہے۔

اور رہ گئے باقی کے وام تو وہ خود کو جلد جلد خواص میں تبدیل کر رہے ہیں' عوام کو خواص بنانے والی مشین کا پہیہ تیزی سے چکر کاٹ رہا ہے۔

تم کلف اور Beatniks کے نمائندے ہو مسعود نے کافی میری پیالی میں اپنے ہاتھ سے ڈالی ہے' میری جان Beatles کہو۔ Beatniks اور Beatles میں بڑا فرق ہے۔

فرق ہو یا نہ ہو' تم ہماری نئی نسل کو تباہ کر رہے ہو' مسعود کی کیپٹن مجھ گئی ہے اس لئے اب اس نے میری سڈ بائن کی ڈبیا میں سے سگریٹ کھینچ لیا ہے۔ تمہاری نئی نسل کو نہ میں تباہ کر رہا ہوں اور نہ تم' لیکن پھر بھی وہ تباہ ہو رہی ہے' یا پھر یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ہم دنوں مل کر اپنی نسل یعنی پرانی نسل تباہ کر رہے ہوں یا پھر ممکن ہے کہ وقت میرے اور تمہارے ہاتھوں یہ سب کروا رہا ہے' تم نے اپنے Teen agers میرا مطلب ہے نئی نسل کے لئے کون سا اور کس مقدار میں ادب پیدا کیا۔

واہیات ہو تم! مسعود کہیں دور دیکھ رہا ہے' ضروری اس کے کسی بیداری یا نیم خوابی کے دیکھے ہوئے خواب کی تعبیر الٹ ہو گئی ہے' اس لئے کہ اب اس کے چہرے پر خالد خاں والی بے بسی ہے۔

دیکھو میری جان اب بھی مان جاؤ۔ میں بیگم انعام اللہ تھیوری کے آگے ہتھیار ڈال چکا ہوں' میں نے اپنے اندر کے سارے شور اور سارے ہنگامے کو سلا دیا ہے اور میرے اندر فی الحال کوئی الجھن کوئی کش مکش نہیں۔

کون سی تھیوری؟

یہی کہ اب انسانیت کو ایک ہی نقطے اور مرکز پر متحد کیا جا سکتا ہے اور وہ کلف کے رکارڈ Beatles اور رولنگ اسٹونس کی تہذیب ہے' قطامہ ہے' بیگم انعام اللہ حرافہ ہے۔

مسعود اتنی تیزی سے سگریٹ پر سگریٹ مت پھونکو میری وڈ بائین میں کل دو سگریٹ باقی رہ گئے ہیں۔ اور بیگم انعام اللہ کا بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ وہ اس وقت اپنے باغ میں بنی روکری کے ارد گھرد کھڑے ناگ پھنی کے پودوں پر جراثیم کش دوائیں چھڑکوا رہی ہوں گی اور ان کے دونوں لڑکے اور بڑی لڑکی اپنے اپنے دوستوں کے ساتھ اپنی کوٹھٹ کو رقص گاہ میرا مطلب ہے ہال کے فلور پر ٹوئسٹ بلکہ شیک کے رکارڈوں کی گت پر رقص فرما ہوں گے۔

شیک! شیک؟

واہ مسعود میاں یہ بھی خبر نہیں ٹوئسٹ اب والز رمبا اور چاچا کی طرف آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے۔

چھوڑو مجھے نہیں دلچسپی تمہاری مغرب زدگی سے۔

یہ مغرب زدگی نہیں رہی مسعود! میری مانو مغربی موسیقی کے پاکستان اور بھارتی پروگرام باقاعدگی سے سنو تو تم کو احساس ہوگا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان دن بھر کشمیر حال رہتا ہے اور ساڑھے دس بجے رات یہ خلیج خود خود پٹ جاتی ہے۔ اگر اناؤنسر بیچ بیچ میں اپنے اسٹیشن کے متعلق یاد دہانی نہ کروائیں تو تم کو مطلق پتا نہ چل سکے گا کہ یہ کس ملک اور کس اسٹیشن سے نشر ہو رہا ہے۔ دہلی سے کراچی اور پنڈی سے بمبئی والوں کے لئے چھوٹے چھوٹے جذباتی اور مخلص پیغاموں کے ساتھ اپنے خاندانی اور قلمی دوستوں کے نام بھجوائے جانیوالے رکارڈ سن کر مجھے یوں لگتا ہے کہ بیگن بادشاہ زادی کی سوکن نے گلے وہ وہ مالا اتار دی ہے جس میں بادشاہ زادی کی جان تھی اور دن بھر مردہ رہنے کے بعد وہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی ہو۔ یہ وہ نقطہ اتحاد ہے..... میری بات ادھوری رہ گئی ہے' مسعود بھنا کر اٹھ گیا ہے اور مجھے کیفے میں اکیلا چھوڑ گیا ہے۔ میں یہاں اکیلا کھڑا ہوں۔ اس کیفے کے باہر موٹریں' رکشا اور اسکوٹر کے بعد ایک گزرتے جا رہے ہیں' بیگم انعام اللہ کی گاڑی بھی ابھی ابھی سامنے سے گزری ہے۔

ایل ای چھہتر ہزار دو سو بیالیس ان ہی کی گاڑی کا نمبر ہے۔ وہ خود ڈرائیو کر کے گاڑی لے گئی ہیں' ان کا رخ جم خانے کی طرف ہے اور ان کی گاڑی میں پیر انعام اللہ موجود نہیں۔

ان سڑکوں پر بہت ہنگامہ ہے اور میرے دل میں بھی بڑا شور و شر اور ہنگامہ ہے۔ پھر بھی میں سڑکوں پر گھومتا رہوں گا۔ میں گھر کے اندر اس وقت تک داخل نہیں ہونا چاہتا جب تک کہ میرے قدم زبردستی مجھے گھسیٹ کر وہاں نے لے جائیں' میں گھر جانے سے اس لئے نہیں گھبراتا کہ وہاں کسی کا تبسم اور ہنستی ہوئی آنکھیں میری منتظر نہیں' یہ ایک اور خواب خوش تھا جو میں نے اکثر دیکھا' اور خالد خاں کے فال نامے میں اس کی تعبیر بھی الٹ ہی نکلے گی۔

جس طرح سرکاری ملازمت کے لئے میری نکل چکی ہے شاید اسی طرح..... ہاں تو میں اپنے اس خواب کے ڈر سے واپس جانا نہیں چاہتا جو میں نے اس سحر کے بعد بھی اکثر دیکھا ہے کبھی سوتے میں اور کبھی جاگتے میں۔

آہ میرا وہ خواب چبھی پھانس کی طرح کب پک کر اور مواد بن کر پھوٹ بہے گا۔

اس لئے کہ میں وہ خاب کسی قیمت پر بھی کسی کے آگے بیان نہیں کرنا چاہتا۔ یہی تو ہو خواب ہے جس کی تعبیر خال خان کے فال نامے میں بھی نہیں۔

اس کا اور اس شور و شر کا انجام کیا ہونا ہے جو اس خواب کے نتیجے میں میرے اندر برپا ہے۔ مسعود کہتا ہے دیوان حافظ سے بڑی سچی فال نکلتی ہے۔

مسعود بھی عجیب ہے۔ پتا نہیں وہ اتنی دور دور کیوں بھاگتا ہے اور جو میں کیٹس' بائرن یا پھر ایلیٹ کے دیوان سے فال نکال لوں تو پھر اس کے مرچیں لگ جائیں' مگر خیر یہ فاصلے بہت بعید ہیں سوچ رہا ہوں اور چل رہا ہوں اور آخر کر میرے قدم مجھے گھر کے دروازے پر لے آئے ہیں اور اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں میر کے دیوان سے فال نکالوں گا۔

وہ بہت بھولا بھالا اور بے ضرر انسان تھا اور اس پر تو شراب خواری کی تہمت بھی نہیں اور اب میں نے دیوان اٹھا لیا ہے۔

مگر مجھے تو فاتحہ پڑھنا نہیں آتی' خیر خدا مجھے معاف کرے اور میر کو بھی' اور میرے اندر کے اس شور و شر کو بھی۔

میری انگلی سطروں پر چلتی رک گئی ہے اور میں نے آنکھیں کھول دی ہیں۔

رہتی تھی بے دماغی اک شور ما و من میں
آنکھوں کے مند گئے پہ آرم سا تو پایا

ہائیں کیا کہا تم نے میر جی! اور یہ تم خالد خاں بھی تو نہیں کہ جس کو ڈپٹ دیا جائے۔

دیوان میرے ہاتھ سے پھسل کر گیا ہے۔ ایک اور رات۔

اور اب اس رات کی سحر قریب ہے۔

آج کی رات مجھے کسی خواب کا خطرہ نہیں ہے اس لئے کہ آج میں اپنے خواب کی طلسمات سے آزاد ہو چکا ہوں۔ کہتے ہیں خواب انسان کو اس وقت تک سرگرداں رکھتے ہیں' جب تک وہ اسے کسی کے سامنے بیان کر کرے اس کی تعبیر نہ لے۔ ہاں میں سچ ہی تو کہتا ہوں۔

عزیز مصر نے خواب میں دیکھا۔

کہ سات دبلی گائیں ہیں جو سات فربہ گایوں کو کھا رہی ہیں اور اس نے مزید یہ بھی دیکھا کہ سات گیہوں کی سوکھی بالیاں ہیں اور ساہری۔

اس کے خواب نے اسے اس وقت تک سرگرداں رکھا جب تک کہ یوسف صدیق کو زندان سے باہر نہ لایا گیا۔ اور یہ مصر کے بادشاہ بھی خوب ہوا کرتے تھے۔ پہلے خواب دیکھتے پھر ان کی تعبیروں کے لئے سرگرداں ہوتے۔

اور تعبیریں ملتیں تو ان کے مطابق عمل کرنے کی فکر میں دبلے ہوتے اور میں عزیز مصر تو نہیں پھر اب ان دنوں ہمارے عہد میں ہوسف صدیق کا زنداں خانے سے نکلنا بھی تو محال ہے۔ چنانچہ آج اس رات سے قبل چار سو پھیلی دوپہر میں پیر انعام اللہ کی لان میں کھڑی رنگ برنگی چھتری کے سائے تلے شیشے کی میز کے گرد چھوٹی چھوٹی نیچی نیچی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے جب میں بیگم انعام اللہ کے سامنے Young Ones کے مسودے پھیلائے کام کر رہا تھا اور بیچ بیچ میں ان کی ہدایتیں بھی سنتا جا رہا تھا۔ تو اسی وقت پیرزادہ صاحب بھی وہیں آ بیٹھے تھے اور انہوں نے مسودے اٹھا کر دیکھنا اور ان پر مختلف اعتراضات کرنا شروع کر دیئے تھے اور اسی آن مجھے محسوس ہوا تھا کہ بیگم پیر انعام اللہ اب Young Ones کی پالیسی بدلنا چاہتے ہیں۔

دیکھو..... اس فیچر کے بجائے اگر کوئی اور فیطر ہو جائے تو بہتر ہے یہ..... یہ کچھ ایسا ہی ہے۔ وہ بات چبا چبا کر کہنا چاہ رہی تھی۔

''مثلاً آپ کو اس پر کیا اعتراض ہے؟ اور آپ کس انداز کا فیچر چاہتی ہیں؟ سارا کام تیار ہوا اور میٹر (Matter) پریس میں جانے والا ہو اور اس وقت سرے سے پالیسی ہی کو غلط قرار دے دیا جائے تو پھر جھنجھلاہٹ تو آپ سے آپ ہی آئے گی۔

بیگم کو میرا لہجہ ناگوار گزرا تھا۔

انہوں نے ناگواری کو دانتوں تلے ہونٹ چبا چبا کر دبایا اور اپنے لہجے کو قابو میں رکھ کر مجھے سمجھانا چاہا۔

''میرا مطلب ہے اس کے بجائے کسی مقامی موضوع پر فیچر ہو جائے۔''

''مثلاً؟ جو پوسٹ آفس کے باہر چٹھیاں لکھنے والے بیٹھتے ہیں ان کے بارے یں فیچر ہو جائے اس مرتبہ!''

''مگر مسز..... میڈم پھر وہ تصویریں اور ان کے بلاک وغیرہ۔''

''بھئی وہ سب ہو جائے گا۔ تصویریں میرے ذمے رہیں۔ کوئی بات نہیں اس مرتبہ کچھ دیر سہی۔''

''مگر اب اس مرتبہ تو یوں ہی چلنے دیجئے' اگلی مرتبہ سہی۔''

''نہیں بھئی بات یہ ہے کہ تمہارے پرچے کا عوام سے کوئی ربط ہی نہیں ہے۔ اپنے عوام' میرا مطلب ہے جمہور سے بے تعلقی تو جرم ہے۔''

میں نے چونک کر بیگم انعام اللہ کو دیکھا تھا۔

وہ انتہائی تن دہی سے بقیہ مسودوں کے جائزے میں مصروف تھیں۔ فرنچ شیفون کی اٹالین پنک ساری اور اسی رنگ کے گرم امریکی بلاؤزر میں وہ بہت خوبصورت اور بہت معصوم معلوم ہو رہی تھی۔ ان کے چشمے کے سنہری فریم سے لے کر ان کے پیروں کی ہسپانوی چپل تک میں ایک نرمی' لطافت اور دل آویزی تھی۔

اور مجھے ان کو ایسا کرتے دیکھ کر بہت دکھ ہوا تھا' یہ شفاف دھلا دھلا جسم اور یہ لطیف اور نفیس لباس جمہور سے قریب آئے' تو ان کا کیا انجام ہوگا۔

اور پھر جیسے کسی نے میرے ہی اندر چونک کر سوال کیا تھا۔

انجام! مگر کس کا؟

اور میں سپ پٹا گیا تھا الجھن اور بددلی نے میرے ذہن کو بھٹکا دیا تھا

''اور نجومیوں نے فرعون کے خواب کی تعبیروں بیان کی تھی کہ اے بادشاہ وہ درخت جو تو نے اپنے پائی تخت کے قریب پھیلتے اور پروان چڑھتے دیکھا ہے اس سے مراد بنی اسرائیل ہے۔

''بنی اسرائیل یعنی تیرے عہد کے جمہور۔''

میں پھر جھنجھلا گیا تھا اس لئے کہ خواب اور ان کی تعبیریں پھر میرے ذہن پر حاوی ہو چلی تھیں اور میں خوابوں اور ان کی تعبیروں سے خوف زدہ تھا' چنانچہ اپنی نوٹ بک لینے میں دفتر والے کمرے کی طرف چلا گیا۔

تو خالد خال بڑی تیزی سے ٹائپ رائٹر پر انگلیاں چلا رہا تھا۔

خال خاں تیار ہو جاؤ' موجود مسودے تقریباً سب کے سب رد ہو چکے ہیں اور اب نئے مسودے ٹائپ کرنا ہوں گے۔

لیکن سر میں تو صاحب کی نامزدگی کے کاغذات ٹائپ کر رہا ہوں' خالد خاں نے یوں جواب دیا جیسے اس کو میری اور مسودوں کی کوئی پرواہ ہی نہ رہی ہو۔

نامزدگی کے؟ میں آج پہلی بار خالد خاں کے لہجے سے مرعوب ہوا تھا۔

یس سر! وہ اسمبلی کے الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں' اس نے ٹائپ رائٹر پر جھکا چہرہ میری طرف اٹھا کر دیکھا تھا۔

اس کے چہرے کی طرف آج پہلی مرتبہ میں نے غور سے دیکھا تھا۔ وہ بے رنگ پیلاہٹ میں ڈوب رہا تھا۔ اور اس پر جا بجا ہڈیاں اور غدود سے ابھر رہے تھے' وہ چہرہ تھا کہ پیلا اور ٹھٹھرا ہوا بے جان پودا۔

میں اس کو دیکھ کر یوں حیران رہ گیا جیسے وہ آج ہی پہلی مرتبہ میرے سامنے پڑا ہو۔

خالد خاں! میں نے اس کو آواز دی۔

ہوں! وہ بے اعتنائی سے کاغذ پر حروف ٹٹولتا ہوا بولا تھا۔

اور پھر میں اس سے یہ پوچھے بغیر باہر نکل آیا تھا کہ:

خالد خاں تمہارے ہونٹوں کی رنگت اور آنکھوں کی جوت کس نے چوس لی ہے۔

اپنی نوٹ بک اور فائل لئے ہوئے لان کی طرف جاتے جاتے میری نظر بکائین کے گھنیرے درخت کی جڑ کی طرف گئی اور اس کی جڑ کے بہت قریب بلکہ ساتھ ایک ننھی سی کھمبی اگ آئی تھی۔ میرا ذہن بدستور سوچ رہا تھا۔

خالد خاں' بیگم و پیر انعام اللہ فنجائی۔

یعنی کھمبی یعنی وہ بے رنگ و بو چھتری نما پودا جو اپنی بقا اور غذا کے لئے دوسرے توانا اور گھنے درختوں کا محتاج ہوتا ہے جو چپکے سے دھیرے سے اپنے برگ و بار وجود سے بال بھی زیادہ باریک ڈورا کسی ہرے بھرے درخت کی رگ' میرا مطلب ہے' جڑ میں پیوست کر کے آرام سے اس پر پلتا رہتا ہے۔

اپنے سائنس ماسٹر کی سالہا سال پرانی دھمی اور ٹھیری ہوئی آواز رفتہ رفتہ میں نے سنی تھی اور میں فائل اٹھائے اپنی جگہ پر جا بیٹھا تھا' پھر یوں ہوا کہ اس لان پر لگی رنگ برنگی چھتری تلے بیٹھے میرا سر یوں چکرایا جیسے میں کسی ہنڈولے میں بیٹھا ہوں۔

دھیرے دھیرے ہر مبہم اور غیر واضح چیز میرے ذہن کے پردوں پر اجاگر ہوئی۔

اور پھر میرا وہ خواب جسے میں بیان بھی کرنا چاہتا تو بیان نہ کر پاتا جو میرے ذہن اور احساس کے درمیان مقید تھا' انگڑائی لیتا محسوس ہوا یہاں تک کہ وہ ہر قید سے آزاد ہوا اور میرے ذہن کے پردے پر ابھرا۔

ہاں میں نے اس رات بکائین کا یہی گھنا درخت دیکھا تھا مگر وہ اس وقت اور بھی گھنا نظر آ رہا تھا کہ اس کی ڈالیں ہر ایک چیز پر

چھائی جا رہی تھیں' وہ درخت کسی کے تخت کے پائے کے ساتھ نہیں تھا بلکہ دھرتی کے بیچوں بیچ بڑی توانائی اور شگفتگی سے کھڑا تھا لحظہ بہ لحظہ آندھیوں اور طوفان کے ساتھ ساتھ اس کا محیط بڑھا اور پھر اچانک کڑک اور گرج کے درمیان اس کے اردگرد زمین شق ہوئی اور بے شمار کھمبیاں نمودار ہوئیں' ہاں وہی درختوں کی قوت نمو اور سرسبزی کو چوس لینے والی کھمبیاں۔

ہر کسی کے انجانے میں موہوم بے رنگ اور باریک ڈوراسی رگیں آگے بڑھیں اور درخت کی جڑوں سے چمٹ گئیں۔

اور اب مجھے کچھ یاد نہیں آتا.....

مگر ٹھہرو مجھے اور کچھ بھی یاد آ رہا ہے۔

ان کھمبیوں پر عجیب وغریب ٹوپیاں پہنے چھوٹے چھوٹے ہیولے تھے۔ ان کی شکلیں اور ان کے چہرے! خیر اب میں کچھ اور نہیں کہنا چاہتا' بکائین کا درخت خالد خاں کے پیلے اور گلٹیوں والے چہرے کی طرح ٹھٹھرتا اور سوکھتا جا رہا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور اب پھر مجھے کچھ نہیں یاد آ رہا' لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے اپنا خواب اپنے ضمیر کے سوا کسی اور کے روبرو نہیں بیان کیا۔

میں تو وہاں سے سیدھا اٹھ کر اپنی نوٹ بک اور فائل کے دفتر میں آ گیا تھا۔ میں نے اس کو دراز میں رکھا اور اپنا استعفیٰ لکھ کر خالد خاں کے حوالے کر کے چلا آیا تھا جو اس نے میرے آنے کے بعد بیگم انعام اللہ کے حوالے کر دیا ہوگا۔

مسعود جب میرا استعفیٰ دینے کی وجہ سنے گا تو کس قدر لے دے کرے گا۔ جب اس کو یہ معلوم ہوگا کہ میں نے استعفیٰ اس لئے دیا ہے کہ میں اب Young Ones کی اس پالیسی کو تبدیل کرنے کے حق میں نہ تھا جو میں نے جبراً بیگم انعام اللہ کے ایما ہی پر اختیار کی تھی اور مسعود جس کا مخالف تھا۔

واقعی میں کس قدر جمہور دشمن نکلا۔

اور اب اس رات مجھے مصر کے کئی خواب دیکھنے والے بادشاہ یاد آئے ہیں اس لئے کہ آج کی رات میں نے مصر کے جلاوطن بادشاہ کی موت کی خبر سنی ہے جس نے وینس کے ایک ریستوران کے شور اور ہنگامے کے درمیان میز پر سر رکھ کر چپکے سے آنکھ موند لی۔

اور یہ بھی ایک دلچسپ خبر ہے۔

کلوپیٹرا کے دیس کے فاروق نے جولیس سیزر کے روم میں دم دے دیا۔

اور آج کی شب میں نے ایک برے انسان کی موت پر بہت آنسو بہائے ہیں اور سوچا ہے:

''مصر کے آخری بادشاہ' کیا تو نے ایک بھی خواب نہ دیکھا تھا اور تجھے کبھی کسی یوسف کی رہبری کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ یا پھر یہ کہ تجھے اس کا کھوج ہی نہ ملا۔''

اور میں جو کہ عزیز مصر نہیں ہوں اور نہ ہی میں نے کسی کے روبرو اپنا خواب بیان کیا ہے پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں نے یوسف صدیق کو زنداں خانے سے باہر نکال دیا ہے اور اب مجھے بھی آنکھیں موند لینا چاہئے کہ میرے اندر بے حد شور اور بڑا ہنگامہ ہے۔

◆◆◆

گواہی

بیس تاریخ کے بعد ہی سے چاند کے دن اور تاریخوں کے چرچے چل نکلے تھے جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتا چلا جائے گا۔ ہم اپنے خالی وقفوں میں اسٹاف روم کے سیمنٹ کے فرش والے طویل افسردہ برآمدے کے گملوں سے خالی دروں کے ستونوں کے ساتھ کاسنی پلاسٹک سے بنی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے دنیا جہاں کی باتیں کرتے کرتے گھوم پھر کر چاند کی بات پر آ ہی جاتے اور خیال آرائیاں شروع ہو جاتیں۔ چاند انتیس کا ہوگا۔ چاند تیس کا ہوگا۔ عید جمعرات کی ہے' عید جمعے کو ہونا چاہئے۔ چاند گیارہ کو دکھائی دے گا' چاند بارہ کو.....

چاند! چاند! افوہ یہ چاند صاحب بھی کتنے ''امپورٹنٹ'' ہو جاتے ہیں..... اور خلا والی پبلک اپنے حسابوں سمجھ رہی ہے کہ اس نے اب جا کر چاند پر چھاپا مارا ہے اور یہاں یہ ہے کہ یار لوگ تیرہ سو سال پہلے ہی اس پر قبضہ جما چکے ہیں..... میں نے کرسی کو ذرا دھوپ کی تلاش میں ادھر سے کھسکا کر ٹانگیں پھیلا لیں۔ مگر شاید میرے چہرے پر اس ہنسی کے آثار تھے جو میں نے اپنے دل میں محسوس کی تھی' یوں کہ اب ارجمند نے اپنے مخصوص جارحانہ اور کھلے دل والے انداز میں ہنسی کا سبب دریافت کیا تھا اور جب آپ کو کسی کا جارحانہ انداز دلچسپ معلوم ہوتا ہے تو اس کی بات کا جواب دینا بھی ضروری ہوتا ہے۔

''اچھا تو کیا میں ہنس رہی تھی!''

''تو اور نہیں تو کیا۔''

''ارے بھئی تو ہنسنے کو یہ تھوڑی بات ہے کہ میں بیمار ہوں اور سخت دکھیا ہو رہی ہوں اور پھر بھی اتنی صبح سردی میں علالت سے اٹھ کر یہاں آنا اور پھر واپس جا کر اس کو بسانا پڑتا ہے۔''

یہ کتنی اچھی بات ہے کہ اسٹاف روم کے اس طویل افسردہ برآمدے کے گملوں کے خالی دروں کے درمیان بیٹھ کر ہم اصل بات قبول دینے کے بجائے کوئی بات بھی بنا سکتے ہیں' اس لئے کہ پینتالیس منٹ کے اس مختصر سے خالی وقفے میں ہم کو بہت باتیں کرنا ہوتی ہیں چنانچہ ایک کی ہوئی بات اور اس کا جواب بہت خلد غیر ضروری اور فرسودہ ہو جایا کرتا ہے..... ورنہ اگر انسان جرح کرنے اور دل لی اصلی اور مخالص سوچوں کو قبولوانے بیٹھ جائے' تو کتنی مشکل آ پڑے اس لئے کہ انسان کی سوچ کا بیش تر حصہ احمقانہ ہوا کرتا

ہے۔

چنانچہ عید کے دن قریب سے قریب تر آتے گئے اور اسی حساب سے چوڑیوں' اور جوڑوں جوتوں اور پروگراموں کے تذکروں میں بھی شدت آ چکی تھی۔ سو ہم کو یہ بھی باور کرنا پڑا کہ عید ایک نہ ایک دن آ دھمکے تو کچھ بعد نہیں مگر کس دن؟ اس سے مجھے اس مرتبی ہوں دلچسپی نہ تھی کہ اگرچہ بوجہ علالت انسان تلے اوپر اتفاقیہ رخصتیں تو نہیں لے سکتا۔ تاہم وہ اپنے آپ کو زور سے مشتثنیٰ ٹھہرانے کا مجاز ضرور ہوتا ہے اور انتیس تیس کے پھیر میں بھی نہیں پڑتا۔

چھٹی کا نوٹس میں نے بار بار پڑھا' پتا نہیں کیوں اعتبار نہیں آ رہا تھا' چنانچہ اسی بے اعتباری کے عالم میں ارجمند اور میں رینگتے سسیاتے اپنی منزل کی طرف آگے بڑھے' تو معلوم ہوا کہ عید تو یہاں سے وہاں تک پھیلی پڑی ہے۔

''کیوں نہ ہم لوگ آج بیڈن سے نکلیں۔'' فوراً ہی صلاح بن گئی اور بیڈن کے اندر یہ عالم تھا کہ جو کچھ اور جہاں کہیں تھا سر بازار آ گیا تھا' سر پر چھائے ہوئے شامیانوں اور ان کے رنگ برنگے بانسوں والے دروں میں سے گزرتے ہوئے برات والے گھر کا سا سماں لگ رہا تھا۔

ہر چیز کی کتنی افراط ہے اور کتنی کثرت۔ اجناس اور اشیا کا ایک سیلاب ہے جو حواس گم کئے دیتا ہے' اتنے کہ آٹے اور گھی کی گم گشتگی اور ہر چیز کے چڑھے ہوئے نرخوں تک کا احساس رخصت ہو چکا ہے۔

''ارے بھئی' میں یہاں ٹھیر کر یہ سجی ہوئی مٹھائیاں ضرور دیکھوں گی۔''

ارجمند نے تقریباً مچل کر کہا تھا۔ ''مجھے یہ نظارہ بہت اچھا لگتا ہے۔''

''ضرور دیکھو اور اگر مقدور ہو تو کیا اٹھا کر تصویر بھی کھینچو۔''

''مگر مجھے تو یوں لگتا ہے.....''

''کیا؟''

کیا یہ ضروری ہے کہ انسان اپنی ہر ادھوری بات کو پورا مکمل کرے۔ بہر حال میں اپنی بات مکمل نہیں کی' بھلا یہ بھی کوئی کہنے والی بات تھی کہ ہمیں تو سارے بازار کی سج دھج سے آگے نکل بیٹھنے والی دکانوں کو دیکھ کر بنات النعش گردوں والی پارٹی کا خیال آتا ہے کہ وہ شام ڈلے سولہ سنگھار کے ساتھ سر راہ آ بیٹھتی ہے۔ لیکن کسی نظارے کا یہ کچھ کم احسان ہے کہ وہ آپ کو بہت سی باتوں کے وجود سے لاتعلق کر دے اور آپ کو یہ بھی نہ یاد رہے کہ زندگی میں کچھ خلا بھی ہیں اور ہم نے کچھ کھویا ہے' اس لئے کہ زندگی کا بھاؤ بہت چڑھ گیا

ہے' چنانچہ یہ ہوا کہ ہم خاموش سے آگے بڑھے اور سویوں کے کافوری اور گلابی ڈھیر پر جھکتے ہوئے چاندی کے ورق نے مجھے آنکھ ماری۔

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے

''کیا کہا!''

''آؤ سویاں خریدیں۔''

''یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی کا جہاز عید کے تند تھپیڑوں میں گھر گیا ہو' پھر ارجمند نے عید کے جوڑے اور پروگرام کے متعلق پوچھ ہی ڈالا۔

''چنانچہ اب ہم بھی کپڑوں اور جوتوں کی باتیں کرتے ہیں۔''

''ارے میں گڑبڑا گئی' عید کے دن! پروگرام! یار کیا سوال ہے تمہارا بھی کہ بھئی عید کے دن.....''

مگر ہاں واقعی..... ارجمند کے سوال کے معنویت اور حقیقت پر غور کرنے کے بعد اپنی ذات کس قدر حقیر' شرمناک اور بے ضرورت محسوس ہوئی' جواب کے سارے الفاظ حلق میں اٹکے پڑے تھے اور مجھے اپنی ذاہت واہیات نظر آئی۔

مگر جس کو اپنی ذاقت جس درجے واہیات نظر آتی ہے اسی درجہ وہ اکڑتا اور اپنی خودی کو بلند کرتا ہے۔

چنانچہ میں نے بھی اپنی ذات کے گرد والی فصیل کو اونچا اور مضبوط کرنے کی کوشش کی۔

''ارے بھئی عید کے پروگراموں کا کیا ہے' ایک پروگرام یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آدمی لحاف میں دبک کر مزے سے کتاب پڑھتا رہے' اور یہ دیکھو میں نے آج یہ کتاب ڈاکٹر سے چھپٹی ہے اور بھئی روز کپڑے بدل بدل کر آتے رہو' تو عید کے دن تو کپڑوں کی چھٹی رہنا چاہئے' سخت بوریت کا کام ہے کپڑے بدلنا۔''

''اچھا!'' لیکن مجھے معلوم تھا کہ ایسی باتیں کرتے وقت ہر انسان کے منہ پر سخت پھٹکار برسنے لگتی ہے' چنانچہ اروز اپنے کمرے میں گھستے ہی آئینے کی پیشی میں جانا پڑا تھا' بارے اس وقت تک وہ پھٹکار تحلیل ہو چکی تھی اور یوں ایک بار پھر میں نے شیر ہو کر سوچا تھا' اور جو اس وقت میں ایک عمدہ پر مغز اور مختصر سی تقریر جھاڑ دیتی' تو ہٹاؤ یہ سب تو فروعات ہیں' عیاشی ہے' کہ تم جس کو ثقافت اور روایتوں کا نام دیتے ہو وہ تو نری سودے بازی ہے' مال کی بکری اور نکاس کے ڈھنگ ہیں اور زندگی کے بھاؤ چڑھ جانے کے اصلی سبب..... تو بھی کوئی میرا کیا بگاڑ سکتا تھا۔

لیکن جب اپنی شال اور سویٹر واپس رکھنے کے لئے الماری کھولی تو ہاتھ نے خود بخود سیدھے ہاتھ والی دراز کو کھینچ لیا' فولڈ پلاسٹک کے مریں مریں سے ڈبے پر رکھی سرمئی فائل بلا ارادہ ہاتھ میں آ گئی' یا پھر ہو سکتا ہے کہ اس میں اپنا ارادہ بھی شامل ہو' الماری کے قریب والی چوکی پر بیٹھ کر احتیاط سے سرمئی فائل کو کھولا۔ نسخوں اور ڈاکٹر کی رپورٹوں کے نیچے ایکسرے تھا' سیاہی اور سفیدی مائل بھورے پن میں ابھرتے ہوئے لیبلوں کے پنجر کے اس طرف' ایک بیمار' مغموم اور مایوس دل تھا' معمولی سا انسانی دل..... اس وجود کا حصہ جسے دنیا کے سارے چراغ جلا کر بھی ڈھونڈ لینا میرے بس میں تھا۔

پھر مجھے ہمیشہ کی طرح ناوقت باتیں یاد آئیں۔

اور مجھے لوسی یاد آئی جو برف باری میں لالٹین اٹھا کر اس راستے پر جا کھڑی ہوئی تھی جس راستے اس کی ماں کو کام پر سے واپس آنا تھا۔ رات اندھیری اور برف و باد کا طوفان تند' لوسی کو ڈر تھا کہ ماں راستہ نہ بھٹک جائے۔

پھر یوں ہوا کہ وہ لالٹین اونچی کئے اندھیرے راستوں کو تکتی رہی۔ برف کے گال چپکے چپکے اس کے وجود پر برستے رہے حتیٰ کہ وہ ان کی مکمل حفاظت میں آ گئی۔ اور وہ لالٹین برف کے ڈھیر پر بے سود ٹمٹماتی رہی' یوں کہ ماں نے اپنا راستہ بدل لیا تھا۔

میں نے احتیاط سے فائل بند کی اور وہ بیمار اور مغموم دل فائل کے گتوں کے درمیان چھپ گیا' جس نے انجانے میں ہر سال عید کا جوڑا تیار کیا تھا۔ میں نے فائل دراز میں واپس رکھ دی۔

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

''ہیں کیا کہا؟'' کسی نے مجھ سے سوال کیا۔

میں ایک لفظ بھی نہیں بولی ہوں' میں نے اپنے آپ اپنی گواہی دی۔

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

کوئی بار بار میرے اندر گنگنائے جا رہا تھا۔

اس شام چاند دیکھنے کی ذرا بھی خواہش نہ ہوئی اس لئے کہ میری طبیعت بدستور خراب تھی اور اس وقت بھی پروگرام کے مطابق میں اس بستر علالت پر دراز تھی جو صبح سے خالی پڑا تھا۔

شیر خرمہ تیار تھا اور سویوں کے مزعفر کا پروگرام ناشتے کے بعد تھا' گرم گرم چائے دان میز پر آ چکا تھا' چنانچہ بستر چھوڑنا اب ضروری قرار پایا' پھر یوں ہوا کہ مناشپ شپ کرتے چڑھے' آنکھوں پر عینک غائب تھی۔

''آج عید نہیں ہے!''

''ارے جاؤ' عینک لگا کر اخبار پڑھو پھر اطلاع دو۔''

''انہوں' اخبار کی کیا بات ہے رات اعلان ہوا ہے۔''

''مگر رات تو چاند کا اعلان بھی ہوا تھا۔''

''مگر یہ اعلان آدھی رات کو ہوا تھا۔''

''منم صاحب' تم جب کوئی خبر لاؤ گے ایسی ہی لاؤ گے' فلانی جگہ ''کر'' ہو گیا' وزارت بدل گئی' سفارت اکھڑ گئی' کہیں حکومت کا تختی الٹ گیا' حد یہ کہ شاستری مر گیا' آج لے کے صبح صبح عید صاف کروادی۔''

''پھر کیا خیال ہے؟''

''تم بتاؤ' روزہ کھول رہے ہو؟''

''اب جو سب لوگ فیصلہ کریں۔'' اس کی آنکھوں کی گہری آسمانی رنگت ایسے میں اور بھی دلچسپ ہو جاتی ہے۔

''اچھا پھر جاؤ تم فیصلے کا انتظار کرو۔''

میری نظر کھڑکی کے شیشوں سے پار نکلتی چلی گئی' جنرل صاحب کے طویل سیاہ دروازوں اور سیاہ ستونوں والے گیٹ سے کچھ پرے جھگیوں والوں کے بچوں کے دو گروہ آمنے سامنے کھڑے تھے۔

''آج عید نہیں ہے!'' ایک گروہ نے لے سر سے کہا اور نفی میں گردنیں ہلائیں۔

''آج عید ہے!'' دوسرے گروہ نے اسی انداز میں دعویٰ کیا اور ان کی ہلتی ہوئی گردنوں کا پوز اثباتی تھا۔

''آج عید ہے..... آج عید ہے۔'' اثباتی گردنیں اچھل اچھل کر کہہ رہی تھیں۔

میں نے شیر خرمے کا پیالہ دوبارہ سامنے کھسکا لیا۔

نیچے نہانے کے پانی ٹھنڈے ہوئے جا رہے تھے' کندھوں پر تولئے ڈالے مرد آپس میں بحث کر رہے تھے۔

''جی تو کیا آپ کا خیال ہے کہ شہر شہر کا اپنا چاند نکلوایا جائے؟''

''ارے میاں گواہ..... گواہ..... گواہی کی شرائط ہیں جن کا گواہوں میں ہونا ضروری ہے۔''

''تو پھر عید ہو چکی..... کون ہے گواہی کے قابل' آپ کہ میں؟'' اب سب خاموش ہیں۔

پھر یہ ہوا کہ گھرانا دو فریقوں میں بٹ گیا

میں نے بیماروں والے مخصوص ڈھیلے پن اور بے دلی سے صفائی شروع کر دی تھی' اس لئے کہ بلو کا ڈوڈ آف ہو چکا تھا اور اس نے پھر سے لحاف میں گھس کر بستر کو اور بھی اجاڑ دیا تھا۔

''ارے بھئی تم کیوں غصہ ہو رہی ہو؟ مسلمان ایسے ہی عید مناتے ہیں۔''

مجھے تو یہ خیال آ رہا ہے کہ بچارے ٹیٹو کی پہلی تو عید ہے اور اس میں جھگڑا پڑ گیا۔

''ارے بھئی ٹیٹوں کی فکر نہ کرو۔ اس کی عید کے امکانات روشن ہو گئے ہیں اس لئے کہ اس کے ابا جان نے غسل خانے کا دروازہ بند کر لیا ہے۔''

چنانچہ روزہ ترک کرنے کے باوجود نمازی بٹ چکے تھے' جنرل صاحب کے گیٹ سے اس طرف متعدد لوگ اس حال میں کھڑے تھے کہ اوپر سے قمیص بدل چکے ہیں ٹانگوں میں پاجامہ میلا ہے۔ کسی کا دھڑ رمضان منا رہا ہے' تو ٹانگیں عید۔ ایک صاحب کے سر پر فقط ٹوپی نئی تھی' باقی جسم پر میلے کپڑے..... اور بحث جاری تھی' پھر میں نے کانے حبیب کو دیکھا جو کورا جوڑا پہنے بیساکھی کے سہارے اپنی بے کار ٹانگ کو گھسیٹتا خاموشی سے نماز پڑھنے چلا جا رہا تھا اس کے چیچک مارے چہرے پر تنہائی کا شدید احساس تھا اس لئے کہ وہ غول جس کے ساتھ وہ چھپتا ہوا نماز کو جاتے ہوئے اپنی ساری محرومیوں کو بھول جاتا تھا' ٹکڑیوں میں بٹا حجت میں مشغول تھا۔

میں کھڑکی کے قریب سے ہٹ آئی تھی ''بلو اب اٹھ کر کپڑے بدل ڈالو آئندہ سے ہم کرسمس منائیں گے۔''

''کیوں؟''

''کیا کریں پھر؟''

اگر حبیب کے چیچک مارے چہرے پر تنہائی کا وہ بھیانک احساس نہ نظر آتا' تو ہو سکتا تھا کہ لحاف میں دبک کر کتاب پڑھنے الا پروگرام ملوتی ہو جاتا۔

اور اب ملنے والی پارٹیاں آ رہی تھیں جو بعض جگہوں سے منہ کی کھا کر آ رہی تھیں' اس لئے کہ بعض گھرانوں میں عید نہیں آئی تھی' اور جب پارٹی آوازوں پر آوازیں دینا شروع کر دے تو انسان کس جس حال میں بھی ہو اسی حال میں حاضری دینا پڑتی ہے۔

اب عید منانے اور عید کا بائیکاٹ کرنے والی دونوں پارٹیاں آمنے سامنے تھیں اور بحث ہو رہی تھی' میں نے آنے والوں کے لئے

سویاں اور دوسرے لوازمات لاتے ہوئے الجھے ہوئے فقرے سنے۔

چاند..... گواہی..... رویت ہلال..... گواہی..... گواہ کے لئے ضروری ہے.....

گواہی! گواہی! میں گواہی دیتا ہوں کہ ہم میں سے کوئی گواہی کے قابل نہیں کہ گواہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ صادق' صالح اور مرد مومن ہو' چنانچہ طے پایا کہ اب میں کرسمس مناؤں گی' میں نے دوبارہ لحاف میں لیٹ کر سوچا تھا' اس لئے کہ جھگڑا تو مکھے اور یہ کہ کرسمس میں گواہی کی حاجت نہیں۔

''اور جو جس قوم کی تقلید کرتا ہے وہ اسی قسم کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔''

میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور لحاف کے اندر منہ کر کے سوچا' مگر یہاں تو کوئی نہیں بجز آندرے ژاید کے جو اپنی تصنیف کے ایک گوشے پر چپ چاپ کھڑا ہے' چنانچہ میں نے اس کی تصنیف کو پرے کھسکا دیا اور نہایت ضدی پن سے سوچا تھا۔

ٹھیک ہے جو جس قوم کی تقلید کرتا ہے وہ اسی کے ساتھ اٹھایا جائے گا' چنانچہ میں کرسمس منانے والوں کے ساتھ اٹھائی جاؤں گی۔

لیکن شاید یہ میرا مقدر نہیں کہ میں ان کے ساتھ اٹھائیں جاؤں اور منصوبے میں ہونے والی اس امکانی تبدیلی کی تفصیل یوں ہے کہ.....

جوں ہی یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے سفید برآمدے میں قدم رکھا معلوم ہوا کہ ہمشیرہ عزیز کے علاوہ گھر کے باقی لوگ بھی آؤٹ ہیں اور یہ اطلاع مجھے نینی نے دی تھی جو عموماً اکیلے گھر میں رہ جانے پر دل گرفتہ نظر آتی ہے' مگر آج خلاف معمول ان کے چہرے پر انار سے چھوٹ رہے تھے۔

''اوہ..... ہیلو..... بیگم از آؤٹ۔'' پھر وہ رکیں ''ہیپی عید''

دونوں عیدوں کو گزرے بھی ایک دن ہو چکا تھا۔

''اوہ مسز میک! میں شکریہ خاک ادا کرتا' جب کہ یہ طے تھا اور ان کو نہیں معلوم تھا کہ.....''

''..... کہ میں ان ہی کے ساتھ اٹھائی جانے والی ہوں۔''

پھر اچانک ہی نینی اپنی عادت کے مطابق اکسائٹڈ ہو گئیں۔

''پتا ہے کون آیا ہے۔''

''کون؟'' میں نے بے دلی سے پوچھا۔

وہ اور بھی اکسائٹڈ ہو گئیں اور میز پر رکھے کچھ کیلوں' الائچی کی تھیلی اور ایسی ہی چند چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ دیکھو! اب بتاؤ کون آیا ہے؟''

''کوئی بنگال سے آیا ہے؟''

''نہیں نہیں'' ان کا سر خوشی سے ادھر ادھر ڈول رہا تھا۔

اور اب میں سمجھ گئی تھی کہ آنے والا کہاں سے آیا ہے' ایک لمحے کو میرے اندر اکسائٹمنٹ نے جھرجھری سی لی۔ ستمبر 1965ء کے بعد پہلی مرتبہ کسی شخص کے متعلق سننے میں آیا ہے کہ وہ ادھر سے آیا ہے مگر وہاں سے کون آ سکتا ہے' میں سوچنے لگی۔

''تمہیں معلوم ہے کیا ہوا' میں یہاں اس کرسی پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی کہ مجھے محسوس ہوا کوئی جھکا ہوا مجھے غور سے دیکھ رہا ہے' میں نے نظر اٹھائی.....'' اور وہ ایک دم ضرورت سے زیادہ اکسائٹڈ ہو گئیں اور لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگیں ''میں چونک پڑی میں نے اٹھ کر اسے گلے چمٹایا۔''

''اوہ مائی ڈارلنگ' مائی بوائے فرینڈ.....'' پھر وہ کہتی رہیں ''میرا ہم رقص..... اوہ وہی ڈانسر سوویل.....'' وہ سفید چکنے برآمدے کے فرش پر یہاں سے وہاں تک رقص کے انداز میں لہراتی چلی گئیں..... یہاں تک کہ ان کو دروں میں جڑے ہوئے جالیوں اور روغن کے منتظر کوری لکڑی کے فریم کا سہارا لینا پڑا۔

پھر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''یونو! جب لڑائی ہو رہی تھی تو میں اس لڑکے کے لئے کتنا پریشان ہوتی تھی' مجھے خیال آتا تھا کہ وہ اب کا ہے کو کبھی آئے گا .....اوہ یہ لڑکا' ہی از اے تھورو جنٹلمین.....'' وہ پھر رکیں۔

''ارے میں تو بھول ہی گئی' تمہارے لئے چائے لاؤں؟'' انہوں نے رک کر پوچھا۔

''نہیں شکریہ! نینی مجھے پان دان لا دو' میں پان کھاؤں گی' میرا گلا بہت دکھ رہا ہے۔

پان دان لا کر رکھنے کے ساتھ ہی انہوں نے سلسلہ کلام جوڑ لیا۔

''میں نے ان کو بتایا کہ جب بھی بچے والز کے ریکارڈ لگاتے ہیں تو میں ہمیشہ یاد کرتی ہوں کہ دو سال پہلے کرسمس ایو پر اسی برآمدے میں ہم نے تم نے رقص کیا تھا..... اف توبہ' یہ لڑکا کتنا اچھا والز کرتا ہے' میں نے کتنا چاہا تھا کہ وہ ایسٹر پر یہیں موجود ہو' لیکن اس کا ویزا ختم ہو چکا تھا۔''

میں نے دیکھا ان کا بوڑھا اور پرشکن چہرہ خوشی سے تمتمایا ہوا تھا اور آنکھوں میں کچھ پالینے والی سچی چمک۔

میں نے کرسی سے ٹیک لگالی..... دن دھندلا اور مطلع آبر آلود تھا..... اور میرے سامنے برآمدے کے سفید فرش پر کھڑی وہ بوڑھی عورت تھی جو اندر سے بہت تنہا تھی اور جس پر ہر دوسرے تیسرے مہینے افسردگی کے دورے پڑتے رہتے تھے اور واقعی یہ احساس کتنا شکست خوردہ اور پسپا کن ہوسکتا ہے کہ بچے اب بڑے ہوتے جارہے ہیں' اب مجھ سے کپڑے بھی نہیں بدلواتے' اپنی ذات کی بے مصرفی اتنی ہی تھکا دینے والی ہوتی ہے کہ پھر انسان بچوں کے کمرے میں نیچی سی کرسی پر اسکارف باندھ کر اور بائبل ہاتھ میں لے کر بیٹھ جائے۔

اور کتنی اچھی بات ہے کہ تمہارا بوڑھا دل مسرور ہے' چنانچہ میں تم کو یہ یاد دلانے کی کوشش نہیں کروں گی کہ تم جس شخص کی آمد پر اتنی خوش ہو اس کا تم سے واسطہ اسی قدر ہے کہ تم اس گھر میں بچوں کی دیکھ بھال پر مقرر ہو جہاں وہ مہمان آیا ہے..... وہ عمر میں تمہارے اس بیٹے سے بھی بہت چھوٹا ہے جس سے تم نے اس بنا پر قطع تعلق کرلیا کہ اس نے کیتھولک فرقے میں شادی کرلی تھی اور اب لاپتا ہے۔ پھر بھی وہ شخص محض تم کو خوشی دینے کے لئے تمہارے ساتھ رقص بھی کرلیتا ہے اور بڑے لگاؤ اور توجہ سے تمہارے ساتھ پیش آتا ہے' اس لئے کہ تمہارے روپ میں اس کو وہ نیبیاں اور گورنسیں بھی نظر آجاتی ہیں جنہوں نے اس کو پالا' پروان چڑھایا اور تربیت دی اور یہ کہ تم ان سے باتوں کے علاوہ اس حقیقت سے بھی واقف ہو کہ وہ آپ بھی اندر سے تمہاری طرح تنہا ہے جیسے ویرانے میں کھڑا ہو یکا و تنہا درخت۔

میں چپ چاپ بغور اس تمتمائے ہوئے چہرے کو دیکھتی رہی جس کے ساتھ میں اٹھائی جانے والی تھی۔

نہیں معلوم کہ مسیحا و خضر کی ملاقات کا کیا انداز رہتا ہو' البتہ یہ مجھے خوب معلوم تھا کہ ہمدم دیرینہ سے لوگ باگ کس انداز سے ملتے ہوں گے اور جب کہ ایک دو نہیں متعدد ہمدمان دیرینہ جمع ہوں' چنانچہ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ صاحبان خانہ گھر آنے پر جب آنے والے کے کوائف سے آگاہ ہوں گے تو کس انداز میں غلغل مچے گی لہٰذا میں نے یہی مناسب جانا کہ کمرے میں جا کر لحاف میں دبک جاؤں۔ عزیزی ہمشیرہ سے گپ لگانے کا امکان ختم ہو چکا تھا کہ ان کو مہمان کو ایٹ ہوم کروانا کھلانا ہوگا اور مجھے تو نینی نے اپنے اکسائٹمنٹ میں بچوں کے ساتھ ہی کھلا دیا تھا کہ گھر والوں کی آمد دو بجے سے پہلے ممکن نہ تھی اور مہمان اپنی رپٹ لکھوانے تھانے جا چکا تھا۔

ایسے دھندلے دھندلے دنوں میں سو جاؤ تو رات کا دھوکا کھا کر بھولا بھٹکا کوئی خواب نہیں آنکلتا ہے' لیکن ابھی خواب کے

بکھرے بکھرے اور مختلف سین فٹ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ محسوس ہوا کہ کسی نے مجھے یوں آوازیں دینا شروع کر دیں جیسے بھونچال آ گیا یا پھر کسی کسی جم خانے کے چھوٹے پیگ کی یاد پھر سے آ گئی ہو۔

ناچار ہڑا بڑا کر لحاف پھینک کر باہر نکلنا پڑا۔ میں چائے کی ٹرالی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی کو نظر اٹھا کر دیکھا' وہ سب کے سب چائے ادور چلا رہے تھے اور عزیزی ہمشیرہ اپنے مخصوص نان سیریس انداز میں سگریٹ کے کش لگا لگا کر کہہ رہی تھیں ''ارے کچھ سنا یہ کیا کہہ رہے ہیں ان کی باتیں تو سنئے۔''

میں نے کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے اس مہمان کی طرف دیکھا جو ان سرحدوں کو عبور کر کے آیا جن کو کچھ دن پہلے ہم دشمن کے علاقے اور سرحدوں سے یاد کیا کرتے تھے۔

میرے سامنے جانے پہچانے عینک کے اجلے نفیس شیشوں کے اس طرف جھانکتی ہوئی آنکھوں میں بڑی خاموشی اور عجیب سی بے حسی تھی کہ دیکھنے والے کا دم سا گھٹنے لگے اور ان آنکھوں کو اپنے محیط میں لئے ایک چہرہ تھا جسے پہلے نظر میں دیکھنے والا متانت کہہ تو سکتا ہے مگر اپنے فیصلے پر مطمئن نہیں ہوتا' چنانچہ اسی افراتفری کے عالم میں اوپر نگاہ دوڑائی۔

ارے! میری نظر ٹھٹک گئی..... تو تم بھی انہیں انسانوں میں سے ہو جن پر سے وقت یوں گزرتا ہے جیسے..... خیر کوئی بات نہیں وقت نے اکثر ایسے ستم فرمائے ہیں۔

''اچھا تو کیا کہہ رہے تھے آپ؟'' میں نے صاحب سلامت کے بغیر ہی سوال کیا۔

''کچھ نہیں!'' آنے والے کا چہرہ ہر قسم کے جذبے اور تاثر سے عاری ہوتا تھا۔

میں اس مختصر سے جواب سے یوں مطمئن ہو گئی کہ یہ تع عزیزی ہمشیرہ کا قائدہ ہے کہ یوں ہی زور شور سے آوازیں دیں گی اور بعد میں پتا چلے گا کہ بات تو اس پچھلے پہر سماں اور بھی دھندلا گیا تھا' آسمان بہت بھورا اور پراسرار ہو رہا تھا کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ باد اور دھند بارش بھی لائے ہیں یا نہیں۔ پھر موزیک کے سفید برآمدے کے دوروں میں بغیر جالی اور بغیر پینٹ والی فریم نے انتظار اور بے یقینی کے احساس کو اور بھی چمکا دیا تھا' تو خیر اس طرف پیلی ہوئی لان کی سبزی اور فضا میں دھرا دھراتے ہوئے ہوائی جہاز کی آواز کسی حد تک زندگی کا احساس دلا رہی تھی۔

''کچھ نہیں کیوں! ابھی جو آپ بتا رہے تھے' بتایئے نا انہیں' چائے اور ڈالوں آپ کی پیالی میں؟''

''کیا بات؟'' میں نے پھر سوال کیا اور بے وقوفوں کی طرح سب کی طرف دیکھا۔

''بھئی وہ سفید پوشوں والی بات بتاتے کیوں نہیں؟''

''ہاں' وہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ہوں محسوس ہوتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کی پشت پر ایک سفید پوش کھڑا ہے۔''

''کیا!'' میں نے اپنی کرسی اس درجہ آگے کی کہ ٹرالی گھوم کر آگے جا پہنچی'' آپ سے کس نے کہا..... جھوٹ..... ہوں ..... جھوٹ!''

آواز پر وہی بے حسی طاری تھی'' ہم کیا جانیں' ہم کوئی محاذ پر گئے تھے ہم سے تو انہوں نے کہا جو آپ سے لڑنے آئے تھے۔''

''فوجیوں سے میرا مطلب سپاہی نہیں' افسروں نے کہا تھا۔''

''اللہ جانتا ہے۔''

آنے والا عجیب بے بسی سے مسکرایا۔

''تو اس کا مطلب ہے ہم جن باتوں کو افواہیں' الیوژن اور من گھڑت کہہ کر ٹالتے رہے ہیں۔''

''وہ تو یہ کہتے ہیں جب بھی لاہور پر بم پھینکنے کی کوشش کی کسی سفید پوش نے اپنی چادر میں سمیٹ لیا۔''

''اب یہ آپ نے دل سے گھڑ لیا۔''

تب میری بے اعتباری پر اس شخص نے اس انداز سے دیکھا کہ مجھے محسوس ہوا جیسے کہہ رہا ہو..... جیسے کہہ رہا ہو..... مجھے کیا غرض پڑی ہے جو باتیں دل سے گھڑ گھڑ کر سناؤں اور وہ بھی تمہارے اپنے شہر کے متعلق۔''

''اچھا ایک بات بتایئے' بالکل سچ سچ! یہ باتیں مسلمان فوجیوں کی زبانی سنی ہوں گی؟''

''اس بات کی میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ اس موضوع پر کسی مسلمان فوجی سے قطعی گفتگو نہیں ہوئی۔''

تو پھر..... تو پھر.....''

میرے کانوں میں وہ آواز گونجی جو اکتوبر 1965ء کی صبح بہت سویرے سویرے چائے کی میز کے قریب سنی تھی۔

''چونڈہ میں کیا ہوا..... کیا بتاؤں! اگر کچھ کہوں گا تو یقیناً تم لوگ کہو گے پھر گپ ٹھونکی!''

ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اکثر اور بارہا گپیں ٹھونکی ہیں' لیکن اگر اس وقت میں کچھ بتاؤں تو وہ گپ ہرگز نہیں ہوگی' مگر مجھے یقین ہے کہ وہ بھی گپ کی ڈومیں ڈال دی جائے گی..... مگر میں بیان ضرور کروں گا اس لئے کہ اگر میں نے اب نہ بیان کیا تو

شاید..... پھر وہ آواز بھاری ہوگئی تھی اور مسلسل میرے کانوں کے پردوں کے اس طرف اترتی چلی جارہی تھی یہاں تک کہ میں نے سنا:

تب اس شخص نے کہ جس کا چہرہ چادر کی اوٹ میں چھپا تھا' اس جیپ کے ڈرائیور سے کہا' تم مجھ سے سوال کر کے میری راہ کھوٹی نہ کرو حسن اور حسین آگے جا چکے ہیں اور اب میرے نام کا نعرہ لگنے والا ہے..... اس نے یہ کہا اور آگے بڑھ گیا۔

تب میں نے نظر اٹھا کر اس شخص کی طرف دیکھا جو میجر عمر تھا اور صبح صبح منہ اندھیرے چائے پینے کے لئے ہمارے پاس کچھ دیر کو رک گیا تھا' آنسو اس کی آنکھوں سے سرک سرک کر اس کی وردی پر گر رہے تھے' پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے میز کو مضبوطی سے پکڑ کر کہا: ''پھر میں نے جب اس ڈرائیور سے اس واقعے کا وقت پوچھا تو مجھ پر سناٹے کا عالم طاری ہوگیا' یہی وہ وقت اور محاذ تھا ہاں ہم نے پہلے دن یا علی کا نعرہ لگایا تھا۔''

''ہوسکتا ہے اس ڈرائیور کو الیوژن ہوا ہو۔''

''الیوژن.....!'' وہ ہنسا تھا ''اچھا پھر یہ کرو کہ تم میرے ڈرائیور کو ایک پیالی چائے بھجوادو..... اور اب ہم چلے۔''

اور اب اس دھندلائی ہوئی سہ پہر میں چائے کی اس ٹرالی کے قریب بیٹھا وہ شخص' جو ابھی ابھی ان سرحدوں کو عبور کر کے آیا تھا جن کو ان دنوں ہم دشمن کی سرحدیں کہا کرتے تھے' کہہ رہا تھا: ''وہ کہتے ہیں کہ ایک تو جب وہ نعرے لگاتے تھے' تو ہمارے جوان بد حواس ہوجاتے تھے جیسے پیروں تلے کی زمین سرک جاتی ہے۔''

وہ شخص آج ان سب باتوں کی گواہیاں دے رہا تھا کہ جن کو ہم نے الیوژن' افواہ اور گپ کی مد میں ڈال دیا اور یہ کہ وہ ان صالحین میں سے ہرگز نہ تھا جن کی گواہیوں پر عیدیں منائی جاسکتی ہیں' لیکن خیر اس سب سے مجھے کیا' میرا تو پروگرام بدل چکا ہے۔

''اور جو جس قوم کی تقلید کرے گا' وہ.....''

ٹھہرو' سنو اب وہ پوچھ رہا ہے ''اور یہ ٹوجی اکاؤنٹس کون ہیں۔'' اور اب ایک اسکاؤٹ گنر کی جواں مردی کا قصہ سنا رہا ہے .....اور اب ہم پر صداقت آشکار ہو رہی ہے' اس شخص کا ان محاذوں سے کیا واسطہ' یہ قصے تو ان کی ذریعے پہنچ سکتے ہیں' جو ہمارے محاذوں تک آئے ہوں گے۔

''بات یہ ہے کہ ہمارے فوجی جب نعرے لگاتے تھے.....''

''تمہارے فوجی'' نہ جانے کس نے ٹوک دیا۔

بات کرنے والا سٹپٹا گیا ہے..... اور دوسرے لمحے سر اٹھا کر اس نے کہا ہے..... ''اوہ ٹھیک ہے تمہاری فوج.....''

اتفاقاً میری نظر شفاف شیشوں کے اس طرف ٹکرائی..... ان میں ہر ایک حق اور ہر ایک بات سے دست بردار ہو جانے والی کیفیت کتنی شدید ہے..... اور ایک خفیف سی دھندلاہٹ بھی' اور اس مرتبہ ان کی طرف دیکھ کر وہ دم گھٹنے والا احساس نہیں ہوا بلکہ مجھے کچھ یوں لگا جیسے میں نے الماری کھولی ہے اور بے خیالی میں سیدھے ہاتھ کی دراز سے ایک فائل نکالی ہے اور فائل میں سے ایکسرے نکالا ہے' دھندلائی ہوئی آنکھوں کی طرح دھندلا دھندلا ایکسرے اور ان میں ایک مٹھی بھر دل ہے اور اس دل میں ہر طرف برف کے ڈھیر ہی ڈھیر ہیں اور ہر ڈھیر پر ایک ننھا سا دیپ جھلملا رہا ہے..... مجھے ایک بار پھر لوسی یاد آ رہی ہے..... لوسی جو اپنی ماں کی راہ میں روشنی کرنے نکلی تھی اور اس کی ماں نے پرانا راستہ بدل لیا تھا' اس لئے کہ اس کو ایک قریبی اور سہل راستے کا بھی علم تھا .....اور پھر یوں ہوا کہ تمام رات برف کے نرم نرم گالے اس کے وجود پر چپکے چپکے برستے رہے' حتیٰ کہ برف کے ڈھیر پر اس کی چھوٹی سی لالٹین ٹمٹماتی رہ گئی..... اور لوسی کی یہ کہانی بچپن سے لے کر آج تک میرے لئے پریشان کن رہی ہے' میں نے پہلی مرتبہ بھی یہ کہانی سن کر اپنے چھوٹے سے نرم نرم تکیے میں منہ چھپا لیا تھا اور جب اس کا ایک کونا بھیگ جاتا تھا تو میں چپکے سے اپنی آنکھیں سرکا کر کسی دوسری طرف رکھتی رہی تھی' چنانچہ اب بھی میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں دوسری طرف کر لی تھیں اور یہ سمت تھی سامنے بیٹھے ہوئے انسان کا وہ سر جس پر وقت سے بہت پہلے برف سی جمتی جا رہی تھی' اس لئے کہ جب کچھ لوگ راستہ بدل لیتے تو ..... تو خیر یہ تو لوگوں کے اپنے مسئلے ہیں۔

پر میرا تو انفرادی مسئلہ کسی قوم کے ساتھ اٹھائے جانے یا نہ جانے کا ہے' اب میں کیا کروں کہ اب اگر میں ان کے ساتھ اٹھائی جاؤں تو پھر میری پشت پناہی کے لئے سفید پوشوں کی ضمانت کون دے گا۔

اور عید کے منانے یا نہ منانے کا یہ ہے کہ چاند کی گواہی کے لئے تو ضروری ہے کہ گواہ کچھ ضروری شرطوں پر پورا اترتا ہو' چنانچہ طے یہ پایا کہ چاند کی گواہی دینے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مومنین اور صالحین میں سے ہو' لیکن بعض گواہیوں کی فضیلت اور صداقت کی دلیل ہی یہ ہے کہ گواہی دینے والے مومنین اور صالحین میں سے نہ ہوں' چنانچہ افواہوں' گپوں اور الیوژن کی گواہی کے بعد میرے لئے یہ فیصلہ مشکل ہے کہ کس قوم کے ساتھ اٹھائی جاؤں۔

◆◆◆

چھوٹا مولوی

چھوٹا مولوی اس علاقے پر خدا کا قہر بن کر نازل ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی تو سب سے پہلے مائیکروفون کے اندر منہ ڈال ڈال کر اس کی ٹیسٹنگ شروع کر دی تھی کہ وہ اس کی آمد سے بھی دو دن قبل نصب کر دیا گیا تھا۔ چھوئے چھیڑے جانے پر اس کی کرکراہٹ سارے محلے نے پہلے ہی سن کر قیاس کر لیا تھا کہ مسجد میں لاؤڈ اسپیکر نصب ہو گیا ہے اور یہ کہ اب روزہ کھولنے کے لئے سائرن کی آواز کی محتاجی نہیں رہے گی کہ اس کا کچھ ٹھیک نہ تھا کہ بولنے سے کب انکاری ہو جائے۔

مگر یہ بھی کسی کو خبر نہ تھی کہ چھوٹا مولوی مائیکروفون میں سے نکل کر ہر سو پھیل جانے والی اپنی اس آواز سے اس درجہ خوش ہو گا۔ اور اب تو اس کا یہ حال تھا کہ مسجد میں ادا ہونے والی پہلی پہلی نماز کے متعلق گھڑی گھڑی اعلانات کے بہانے ہی ذرا ذرا بات کے لئے مائیکروفون پر دوڑا جاتا اور وہ اس سلسلے میں اس درجہ اکسائٹڈ تھا کہ اس نے اس خوب صورت اور آرام دہ کوارٹر کی طرف بھی زیادہ توجہ نہ دی تھی جو شہر کے کم ہی پیش اماموں کو نصیب تھا۔ بس یہاں تو وہ تھا اور لاؤڈ اسپیکر پر ہر سو پھیلتی ہوئی اس کی آواز۔

پہلی پہلی نماز کے بعد بٹ جانے والی مٹھائی کی تھیلیوں کے خاتمے کے ساتھ ہی ساتھ لوگوں نے چھوٹے مولوی کے صلاح مشورے کے بغیر ہی یہ توقع باندھ لی تھی کہ اب لاؤڈ سپیکر کا وہی ہمہ وقتی ہنگامہ بھی ٹھنڈا پڑ جائے گا اور شاید ان کی یہ توقع بھی پوری ہو ہی جاتی جو اگر چھپر والی مسجد میں بھی لاؤڈ اسپیکر فٹ ہو جانے کی خبر سارے محلے میں گشت نہ کرنے لگتی، مگر ابھی اس خبر پر لوگوں نے زیادہ توجہ نہ دی تھی کہ معلوم ہوا کہ اس خبر کے بعد سے چھوٹے مولوی کی آواز کائنات کو اپنے آپ میں جذب و محیط کرنے پر آمادہ ہو چکی ہے، چنانچہ پنج گانہ اذانوں سے قبل طویل درود و سلام کا ایک ڈپٹا ہوا سلسلہ تھا کہ مائیکروفون سے لپٹ کر رہ گیا تھا۔

اور اب پبلک نے دوسری مسجد میں بھی مائیکروفون فٹ ہو جانے کی قباحت پر غور کرنا اور لرزنا شروع کر دیا تھا جو شاید ابھی چالو نہ ہوا تھا۔

مگر پھر علاقے میں اس انکشاف سے قدرے اطمینان کی ایک لہر محسوس کی گئی کہ سہارن پور کی پہلی بڑی مسجد میں پہلے بھی لاؤڈ اسپیکر نصب تھا اور اس لئے محسوس کی گئی کہ سہارن پور کی پہلی بڑی مسجد میں پہلے بھی لاؤڈ اسپیکر نصب تھا اور اس لئے چھپر والی مسجد کے مولوی صاحب کو بڑی اچھی طرح معلوم تھا کہ مائیکروفون سے کتنے فاصلے پر کھڑے ہو کر خطبہ و اذانیں دی جاتی ہیں اور یہ کہ ان کا

مائیکروفون چالو ہو چکنے کے باوجود قہر نہیں ڈھا رہا تھا۔

پہلے جمعے کو جماعت شاید کچھ کم رہی تھی' چنانچہ اگلے جمعے کو چھوٹے مولوی نے صبح ہی سے میلاد مع خطبہ کی خوش خبری اہل محلہ کو گھڑی گھڑی سنانا شروع کر دی تھی اور ہر پندرہ بیس منٹ دوڑ کر مائیکروفون پر جاتا اور پھر اس کی آواز یہاں سے وہاں تک گونجنے لگتی۔

جمعے پر جمعے آتے رہے اور ہر گزشتہ جمعے کے مقابلے میں تازہ خطبہ زیادہ سے زیادہ کڑک دار اور ڈپٹتی ہوئی آواز میں ہوتا رہا.....

اسی اثنا میں ایک خبر پھر گشت کرنے لگی تھی اور وہ یہ کہ چھپر والی مسجد میں اتوار کے اتوار درس ہونے لگا ہے تو اس کے ساتھ ہی مولوی نے جمعرات کی راتوں میں اللہ کے ورد کی داغ بیل اس انتظام سے ڈالی کہ سارا کا سارا ورد مائیکروفون میں منہ ڈال کر کیا جائے.....

اور جب اس کو مطلع کیا گیا کہ ورد کے اس اہتمام کے بعد سے عارضہ قلب کے کئی مریضوں کی ای سی جی کے نتائج حیرت ناک حد تک مایوس کن نظر آئے ہیں تو اس نے بیماری اور موت کی منجانب اللہ ٹھیرایا اور مرض کی شدت کو آزمائش بتا کر گزشتہ تمام خطبوں سے زیادہ کڑکتا ہوا ناراضگی سے پر ایک خطبہ ہوا کہ لہروں کے حوالے کیا' اور اس سب میں اشارتاً اس نکتے پر زور دیا کہ یہ سب مفسدوں کی شرارت ہے۔

نئی مسجد کی تعمیرات اور سیاست سے واقف لوگ اچھی طرح جان گئے تھے کہ غلطی کس کی تھی۔

پھر رمضان کی آمد کے ساتھ ہی چھوٹے مولوی کی سرگرمیوں میں اور اضافہ ہو گیا' دن کو وہ سر اٹھا کر چلتا کہ اس مرتبہ کسی کو یہ شکایت باقی نہیں کہ سحری میں آنکھ ہی نہیں کھلی اور روزہ کھلنے کے بعد سے اس کا کام شروع ہو جاتا' تراویح ختم ہونے کے کچھ وقفے کے بعد ہی لاؤڈ اسپیکر پر چھوٹے مولوی کی آواز میں وقت سحر کی آمد اور اس کے پل گزرنے کے اعلانات کے بین بین ایک تیرہ چودہ سال کے بچے کی بھی سی آواز میں فلمی گانوں کی دھنوں میں نعتیں جاری رہتیں اور جب محلے والوں کو تشویش ہوئی کہ آخر کرن سا جناتی بچہ ہے کہ جو رات کے اس پچھلے پہر میں اتنی نتھری ستھری آواز میں یکساں تسلسل سے نعتیں پڑھتا چلا جاتا ہے تو پتا چلا کہ یہ تو ٹیپ رکارڈ ہے جس کو مائیکروفون کے سامنے لگا کر چھوٹا مولوی بے فکری سے اپنے کاموں میں مشغول رہتا ہے۔

تو نئی مسجد میں وقت سحر ٹیپ رکارڈر کا ہنگامہ رہتا' لیکن افطاریوں کے خوان چھپر والی مسجد میں اترتے رہے' اور چھوٹا مولوی ایک کھجور سے روزہ کھول کر نماز پڑھانے کھڑا ہو جاتا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ بھی ایک سیاست کا نتیجہ تھا اور یہ سیاست تو اسی دن سے شروع

ہوگئی تھی جس دن فیضو نے اپنے گھوڑے کو پانی پلاتے پلاتے اس خبر کا انکشاف کیا تھا کہ بغل والی خانقاہ میں نئی مسجد بن رہی ہے' اور اس وقت مولوی صاحب جمعے کی نماز کے لئے صفیں تیار کرنے میں مصروف تھے یعنی ناہموار چوبی ستونوں کے سہارے چھائے ہوئے چھپر تلے چٹائیاں بچھانے میں مصروف تھے۔

وہ تو آج پندرہ برس سے بن رہی ہے۔

حاجی موچی نے ایڑی دار چپل کے تلے میں کیل ٹھونکتے ٹھونکتے روک لی۔

میں نے کہا کبھی جامع مسجد ہی نہ بنا ڈالیں کہ آج تک نقشہ ہی پاس نہ ہو پایا' پان سگریٹ کے سجے سجائے کھوکھے کے سامنے بیٹھے بیٹھے پریم پجاری نے ٹکڑا لگایا۔

مولوی صاحب گفتگو میں شریک ہوئے بغیر خاموشی سے چٹائی زمین پر پھیلاتے رہے' لیکن جب خیر دین نے سواری کو تانگے میں چڑھتے دیکھ کر گھوڑے کے سامنے سے دانے چارے کا بکس زبردستی ہٹاتے ہٹاتے کہا کہ ہاں جی آج تو صبح ہی صبح اپنے چودھری صاحب اوورسیئر کے ساتھ خانقاہ والی زمین ناپتے پھر رہے تھے تو انہوں نے چونک کر تانگا اسٹینڈ پر بھرپور نظر ڈالی اور چٹائی کا آخری بنڈل اٹھائے دالان میں چلے گئے۔

ناہموار چوبی ستونوں کے سہارے کچی زمین پر چھائے چھپر تلے یہاں سے وہاں تک سلیقے اور صفائی سے بچھی ہوئی چٹائیوں والا دالان پرسکون اور ہر قسم کے آشوب سے بے نیاز معلوم ہو رہا تھا۔

لیکن اس آشوب کی خبر ہر نئے چھابڑی اور کھوکھے والے کی آمد پر تازہ ہوتی رہی۔

کچھ اور سنا' اور پھر تمام دن گاہے گاہے یہ سنا جاتا رہا کہ

نئی مسجد بن رہی ہے!

نئی مسجد! نئی مسجد!

سنتے سنتے مولوی صاحب کا کلیجا پک گیا' اگرچہ اس خبر پر انہوں نے کسی قسم کا تبصرہ کرنا اپنی ہتک سمجھا تھا۔ اور یہ خبر روز ہی اس تمام رقبے میں گھومتی رہی۔ اگر فیض حلیم والا اپنے قلعی والے جھم جھامتے دیگچے میں ڈوئی چلاتے چلاتے اور ادرک' ہر مرچ کے کچومر پر کٹے ہوئے نیبو سجاتے سجاتے حسد بھری آواز میں زیر تعمیر مسجد پر آوازے نہ کستا تو پھر اتنے ذرا سے ای درے میں مشین پر کام کرتا ہوا ٹیلر ماسٹر یا اس کے شاگرد ٹکڑے لگاتے رہتے اور پھر پیلاہٹ لئے خاکی کپڑوں اور پگڑیوں والے کو چوانوں کا تو یہ محبوب اور پسندیدہ

موضوع بن ہی چکا تھا' پھر ادھر بائیں ہاتھ کو پٹرول پمپ کے ساتھ بیٹھنے والا دہی بھلے کی چاٹ والا تو اس خبر پر بہت ہی ناراض تھا اور وہ تو کچھ اس قسم کے خیالات رکھتا تھا کہ

''بس دیکھ لی ہیں ایسی ایسی مجدیں بنتی' دیکھ لینا عین درمیان میں آ کر رقم گھٹ جائے گی' پھر گھر گھر چندے مانگتے پھریں گے تعمیر مسجد کے۔''

مگر ایسی کوئی بات نہ تھی' رقم وقم کوئی نہیں گھٹی بلکہ مسجد تیزی سے شکل نکالتی چلی آ رہی تھی۔

بلکہ اب تو یہ تھا کہ اس کی شان وشکوہ کی افوائیں اور داستانیں گشت کر رہی تھیں۔

ان افواہوں کا سب سے بڑا سرچشمہ اور ذریعہ پریم پجاری کی ذات تھی کہ مولوی صاحب اس کی سگریٹوں میں چرس فروشی کی معتبر افواہوں کی بنا پر مولوی صاحب اس سے سدا کبیدہ رہتے تھے اور اسی وجہ سے اس کو مسجد کے زیر سایہ تین دن سے زیادہ بیٹھنا نصیب ہوتا کہ بکری کا سب سے زیادہ چانس یہیں تھا۔ لیکن ہر دوسرے تیسرے دن تانگے والوں کو اس کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانا پڑتی تھیں' مگر ان دنوں وہ باقاعدگی سے آنکھیں مچر مچر کرتا ایکا تنگ پر ذرا جھک کر اور زور دے کر چلتا ہوا آتا اور پورے اعتماد اور وثوق سے مسجد کی بغل میں اپنا کھوکھا جماتا اور کاروبار چمکانے کے ساتھ ساتھ ''نئی مسجد'' کی باتیں بھی کرتا جاتا۔

''سنگ مرمر کا فرش ڈلوا رہے ہیں' مار جاتے درخت لگ رہا ہے پھلوں کا۔'' خبروں سے زیادہ حاجی کو اس کی خجی آواز پر تاؤ آتا تھا۔

تاج محل کا روضہ تو نہیں بنوا رہے ہیں' ارے ہاں نہیں تو تیری بھی باتیں۔ ارے اس کی باتوں کا کیا ہے' سلطان اپنے پھیکے پھکس خربوزوں کی ڈھیری برابر کرتا ہوا لقمہ دیتا۔

یار سلطان تو دنیا بھر کا فصل سے اترا ہوا فروٹ کیوں بیچتا ہے' تب پریم پجاری الٹا سلطان پر پلٹ پڑتا۔

اور یہ واقعہ تھا کہ وہ یا تو موسم شروع ہونے سے پہلے ادھ کچرا اور آندھی میں گرا ہوا پھل لا کر لگاتا یا پھر فصل سے اترا اور ڈھلا ہوا انتخاب کرتا۔

''تو اپنی کہہ ابھی کھول دو مولوی صاحب کے آگے تیرے سگریٹوں کی بات۔''

سلطان لال لال آنکھیں نکالتا' تو یہ جھگڑا مولوی صاحب کو بھلا معلوم ہوتا کہ اس میں نئی مسجد کی بات دب جاتی۔

پھر جس دن نئی مسجد کا مینار اتنا اونچا ہوا کہ ادھر والوں کو اس کی پاڑوں پر کام کرتے مستری اور گارا لے جاتے مزدور نظر آنے لگے' تو

واقعی بڑی کھلبلی پڑ گئی اور اتنی باتیں ہوئیں اتنے آوازے کسے گئے کہ اڑے اڑے سے سرخ رنگ کے کوکا کولا کے اسٹال والے کو ٹوکنا پڑا۔

''یار ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے مسجد مسجد سب برابر' یہ بھی خدا کا گھر وہ بھی خدا کا گھر۔''

''ارے بھائی تیری کیا برابری تو ٹھیرا بڑا آدمی' تیرا اسٹال کھڑا ہے کوکا کولا کا' تو نہ یہاں نماز پڑھے گا' نہ وہاں۔'' سلطان نے طعنہ دیا۔

''تو پھر کیا ہوا عقید بقر عید تو شاہی مسجد جاتا ہے۔'' حلیم والے نے دیگچے میں گرم مصالحہ برکتے ہوئے کہا۔

''بھائی سو بات کی بات یہ ہے کہ یہ ہوا بڑا آدمی جو نئی بات چلے گی یہ ہو لے اس کے ساتھ پہلے اس سے نیبو کے شربت کا گھڑا رکھا' پھر آ گئی کوکا کولا' اور اس نے کھڑا کر لیا اسٹال' اور اب بے ایمانی تو دیکھو اسٹال کوکا کولا کا' بکسے بھی اس کے اور بھر رکھی ہے' بیئر اور شیزان'' تو خیر وہ بڑا آدمی ٹھیرا دیا گیا تھا۔

لیکن حقیقت یہ تھی کہ چھابڑیوں اور کھوکھوں اور اسٹال کے اس طرف سچ مچ بڑے لوگ بھی خاموش تھے' فرنیچر کی دکان' کیمسٹ اور ڈرائی کلینر کے علاوہ جنرل اسٹر والوں کی واقعی سج دھج والی دکان' اور یہ کہ یہ سب چھوٹے بڑے اسی چھپر والی مسجد میں اپنی پانچوں' دونوں تینوں یا ایک وقت کی نمازیں عرصہ بیس سال سے ادا کرتے رہے تھے کہ پاکستان بننے کی خوشی میں ایک جمعہ شامیانے تلے یہاں نماز پڑھی گئی اور دوسرے جمعے سہارن پورے سے یہ مولوی صاحب پہنچے اور اس دن سے اور آج تک انہوں نے نماز پڑھائی اور ان سب نے پڑھی تھی' تو چنانچہ یہ بڑے لوگ خاموش تھے' مگر ان کی خاموشی کوکا کولا والے کے نقطہ نظر سے قطعی مختلف تھی۔

وہ تو اب تک تیل دیکھ رہے تھے اور تیل کی دھار کی اتنی جلد انہیں توقع نہ تھی اور آج وہ دھار تقریباً پوری ہوتے ہوئے مینار کی شکل میں اوپر اٹھ آئی تھی' تو چنانچہ اس جمعہ کے بعد مسجد میں مقتدر دکان داروں کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں پہلی بات تو یہ تھی چودھری صاحب کے اس اقدام کی مذمت کی گئی کہ یہ قطعی ثواب کا کام نہیں ہے کہ آدمی ایک آباد مسجد کو ویران کر کے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کی آبادی کا سامان کرے۔

اب یہ ایک الگ مسئلہ تھا کہ دراصل ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کا اطلاق کون سی مسجد پر ہو رہا تھا' چنانچہ یہ طے ہوا کہ اہل محلہ جس میں بلڈنگوں اور کوٹھیوں والوں کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا' اپنی چھپر والی مسجد کو برقرار رکھیں گے' اور یہ بھی تجویز کیا گیا کہ اب اس مسجد میں بجلی کی فٹنگ ہو جانا چاہئے جس کی تجویز پچھلے دس سال سے زیر غور تھی۔

اس جمعے کو مولوی صاحب کے علاوہ مقتدر دکان دار بھی اداس تھے کہ یہ نئی مسجد کا سچ سچ تعمیر ہو جانا ان کو اپنی ہتک محسوس ہو رہی تھی اور اس سلسلے میں وہ خاصے جذباتی ہو رہے تھے۔

ہم نے تو پاکستان بننے کی خوشی میں اپنے اللہ کے آگے سجدہ شکر کیا تھا' اس زمین پر خواجہ صاحب کی آنکھیں نم ناک تھیں۔ انہوں نے جس دن سے ڈاڑھی رکھی اور لمبا کرتہ پہننا شروع کیا تھا ان کی شکل پر نہ صرف معصومیت برسنے لگی تھی بلکہ بات بات پر پلکیں بھی بھیگ جاتی تھیں۔

نہیں جی اب یہاں بجلی تو بس آ جائے گی انشاء اللہ کل ہی میں اپنے سالے کو پکڑتا ہوں' کھوکھر صاحب دین دنیا دونوں ہی میں پکڑ دھکڑ کے شدت سے قائل تھے اور بات بات پر ان کی آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں۔

بجلی کی فٹنگ تو ہو گئی اور چھپر کی دلہنیوں کے ساتھ پنکھا بھی لگ گیا' لیکن ساتھ ہی پریم پجاری ایک اور ہی دل دوز خبر لایا۔

کچھ اور سنا بھائی فیض' اس نے مولوی صاحب کو سنا کر کہا' پیش امام کے لئے مسجد کے ساتھ وہ شان دار کوارٹر بن رہا ہے جانو بنگلہ' اور یہ کہتے کہتے اس نے سلطان کی بے فصلی سخت ناشپاتیوں پر حقارت سے نظر ڈالی۔

لیکن آج سلطان نے اس کی بات نہیں کاٹی' سر جھکائے گلی گلی داغیلی ناشپاتیوں کو سخت ناشپاتیوں کے نیچے دباتا رہا۔

واقعہ یہ تھا کہ پیش امام کا کوارٹر سچ مچ بن رہا تھا' کچھ دن سے نئی مسجد کی بات پرانی ہو چلی تھی اور اب لوگ اس پر کم ہی تبصرہ کرتے تھے۔

مگر اس روز کوکا کولا کے اسٹال والے نے پہلی مرتبہ مسجد کی بات کی۔

اپنے مولوی صاحب کو نئی مسجد کا پیش امام بنانا چاہئے' کیوں! حق ہے ان کا بیس سال سے اس علاقے میں نماز پڑھا رہے ہیں' پھر اس نے ذرا زور دے کر کہا تھا' سو روپے تنخواہ مقرر ہوئی ہے وہاں پیش امام کی' پھر کوارٹر' بجلی' پانی سب مفت۔

اور اس کی یہ بات سن کر سب ہی چپ رہے تھے' کسی کے نفعے کی بات ہو' تو اس میں پہلے ہی سے ٹپ ٹپ بولنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

شاید انہیں خود مولوی صاحب کے فیصلے کا انتظار تھا۔

لیکن مولوی صاحب جو اس وقت روزانہ فقط تہبند اور بنیان میں دھان کے ریشوں والی نرم نرم چٹائی پر لیٹ کر قیلولہ کرتے تھے' اٹھ کر اپنے حجرے میں چلے گئے' اور پھر فوراً ہی نکل کر مسجد کے دالان میں آ گئے' دالان کے آگے تقریباً کنال بھر سے زیادہ زمین لپی

تپی اور صاف ستھری تھی' اس کے گرداگرد گھنٹیوں کی شکل والے کاسنی پھولوں والے درختوں کی باڑھ تھی اور پچھلی دیوار کے ساتھ کنیر کا اونچا اور گھنا درخت تھا جس کے لمبے لمبے کاہی رنگ پتوں کی ڈالوں میں بسنتی پھول اندھیری رات کے تاروں کی طرح جھمکا کرتے' اور یہی وہ جگہ تھی جہاں کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنی دھان کی چٹائی ڈال کر سویا کرتے تھے' دالان سے نکل کر وہ چھپر میں آ گئے' یہی وہ جگہ تھی جہاں آج سے بیس سال پہلے سہارن پور اسپیشل سے آ کر وہ اترے تھے اور خواجہ صاحب ان کو پہچان کر ٹھکانے کی تلاش سے بے نیاز کر دیا تھا پھر ان ہی کی امامت میں پہلی دفعہ زمین کے اس خالی قطعے پر ایک نماز شکرانہ ادا کی گئی تھی' بائیں ہاتھ والی سیمنٹ کی پکی سرخ دیوار کے ساتھ پانی کے نل لگے تھے' وضو والی چبوتری کے ساتھ والے ٹھنگنے کنیر کی ڈالوں سے گلابی گلابی پھول چبوتری پر برس رہے تھے۔

وہ کتنی ہی دیر نیلے آسمان پر اڑتے بادلوں اور ذرا ذرا سے پرندوں کو دیکھتے رہے پر یکا یک ان کو احساس ہوا کہ چبوتری کے پایوں پر کائی جم رہی ہے۔ وہ حجرے میں سے کھرپی نکال لائے اور کھرچ کھرچ کر کائی صاف کرنے لگے' صابن' پانی اور کائی میں الجھی ہوئی وضو کرنیوالوں کی کھنکاروں کا ملغوبہ کھرپی کے کناروں سے سرک سرک کر نالی میں بہتا رہا اور وہ اپنا کرتہ سمیٹے کائی کھرچتے رہے۔

اور یہی ان کا فیصلہ تھا' چنانچہ ایک مدت کے بعد اس شام تانگے والوں کو پریم پجاری کی تلاش میں نظریں ادھر ادھر دوڑانا پڑی تھیں۔

تو چنانچہ اس کوارٹر میں چھوٹا مولوی آ کر بسا' جو قد و قامت' وضع قطع اور عمر ہر طرح مولوی صاحب سے مختلف تھا اور گٹھا ہوا چکلے شانوں اور کالی بھونرا سی ڈاڑھی والا گھن گرج سی آواز والا آدمی تھا' اور بگلا سی سفید ڈاڑھی والے مولوی صاحب کا حلیہ بھی اس سے بہت الگ تھا۔ بظاہر چھوٹا مولوی بڑا آدمی تھا' رہنے کو کوارٹر' سو روپے تنخواہ اور بجلی پانی کی سہولت۔ پھر وہ ایک دن اپنی آواز کے حصار کی طرف سے مطمئن ہوا تو اپنے بال بچوں کو بھی لے آیا۔ اور لوگوں کا خیال تھا کہ یہیں سے اس کے زوال کی داستان بھی شروع ہوئی۔

گاؤں میں زمین پر سے جو دانے دونے وصول ہوتے تھے وہ اس کے بال بچوں کے آ جانے سے اور اس کے فارغ البالی کے قصے سن کر بڑے بھائی نے اپنا جانا اور اس کی وصولی یابی شروع کر دی۔ تو خیر پہلے پہل تو اس نے اس خبر کو زیادہ لفٹ نہ دی تھی۔

چند چن بعد یہ سننے میں آیا کہ چھوٹا مولوی آئے گئے سے عربی' فارسی کی ٹیوشنوں کے بارے میں کہنے لگا تھا۔ اس میں شک بھی نہیں تھا کہ وہ عربی' فارسی خوب جانتا تھا۔

اس خبر کے آگے بڑھتے ہی چھپر والی مسجد میں مقتدر دکان داروں کے مشورے سے طے پایا کہ خود چندہ کر کے ایک رقم مولوی صاحب کر دیا کریں گے' اور وہ محلے کے بچوں کو مفت قرآن پاک پڑھائیں گے' چنانچہ سردی' گرمی کی سہ پہروں میں ان لوگوں کے بچے بھی جو نمازنئی مسجد میں ادا کر رہے تھے' سیپارے اور رحلیں اٹھائے ڈھیلے ڈھلے قدم ڈالتے اور آسمان پر کنکوے ٹٹولتے چھپر والی مسجد کی طرف جاتے نظر آنے لگے۔

اور چھوٹا مولوی اب تک ٹیوشن کی تلاش میں مصروف تھا۔ اس کے ہر سن وقد وقامت کے بچوں سے کوارٹر کا اکلوتا اور بڑا کمرہ بھرا رہتا تھا بجز اس وقت کے کہ ان میں سے آدھے درجن کے قریب اسکولوں کو چلے جاتے تھے۔

چھوٹے مولوی کے اجلے اور گھٹنوں سے بہت نیچے ڈھلے ڈھالے کرتے اور پگڑی کا کلف استری کے بجائے پیلا اور ملگجا پن نمایا ہونے لگا تھا۔ پھر ایک دن اس کے کرتے کی پشت پر ایک مربع فٹ کے لگ بھگ ایک پیوند نمودار ہوا۔

اور اس تمام عرصے چھوٹے اور بڑے مولوی میں بارہا ایک دوسرے کے نزدیک سے گزرنے کے' صاحب سلامت نہ ہوئی تھی۔

شروع میں تو چھوٹا مولوی اکڑا اکڑا اونچی بنا پھرتا تھا' مگر اب یہ سننے کے باوجود کہ اس کو اپنا وہ سو روپے کا ماہانہ کا مشاہرہ پوری اور مکمل رقم کی صورت میں وصولنا نصیب نہ ہوا۔ مولوی صاحب اس کو دیکھ کر آنکھیں چرا لیتے تھے۔ انہوں نے یہ خبر بھی سنی تھی کہ وہ اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں تین مرتبہ مڈوائف کی تلاش میں جاتا دکھائی دیا تھا ''لاحول والاقوۃ' یہ مسجد نہ ہوئی.....'' بس وہ تو اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو جاتے۔ ان کا کنبہ سدا گاؤں میں آباد رہا اور کسی پر یہ راز نہ کھلا کہ ان کا خاندان کتنے افراد پر مشتمل ہے۔

پھر ایک دن اس نے سلام میں سبقت کی تو مولوی صاحب کو اگرچہ سلام میں اس کا سبقت لے جانا کھلا تو بہت' مگر انہوں نے سنت کے طور پر جواب دیا' اور چور آنکھوں سے اس کے گرد آلود جوتوں کو دیکھا۔

وہ جا چکا تھا اور حلیم والا کہہ رہا تھا:

بچوں کو ذرا تہذیب نہ سکھائی' مارا اتنی تو اچھی مسجد اور تم یہ دیکھو کہ برابر والی نالی اس کے بچوں کی غلاظت سے پٹی پڑی ہے اور یہ سالا اگر بتیاں جلا کر اس کی خوشبو میں تعفن کو دبانا چاہتا ہے۔

پھر وہ اکثر سلام میں سبقت کرتا رہا' اس کی آواز قدرے نرمی اختیار کرتی جا رہی تھی' ویسے بڑی قسم کے اہل محلہ نے ایک درخواست بھی گزارنی تھی کسی بڑے دفتر میں کہ اس کی وقت بے وقت کی خطابت اور نعت خوانی نے علاقے کا سکون درہم برہم کر رکھا ہے۔

ایک بار مولوی صاحب نے دیکھا کہ وہ کوکا کولا کے اسٹال سے ایک سیون اپ قرضے پر لے گیا تھا' گھر میں کچھ طبیعت ناساز ہے' اس کی آواز میں خفیف سی عاجزی تھی۔

کتنے ہی دن گزر گئے۔

پھر ایک دھندلی سی اداس اور شام کو مولوی صاحب نے محسوس کیا کہ وہ وضو والی چبوتری کے قریب سے کئی بار گزرا اور ٹھٹکا جیسے اندر آنا چاہ رہا ہو کہ اسی راستے نمازی اندر آتے تھے۔ اس کے چہرے پر عجیب سی خجالت اور خلش تھی۔

تو چنانچہ انہوں نے آنکھ اٹھا کر اس کو سلام میں سبقت کی اجازت دی اور اس نے فائدہ اٹھایا۔

حاضر ہو سکتا ہوں' آواز میں خجالت اور بھی نمایاں تھی۔

انہوں نے قدرے نخوت سے سر ہلا دیا۔

وہ اندر آ گیا۔ مگر بات کرتے گھبرا رہا تھا' اور بار بار پہلو بدل رہا تھا' پھر اس نے عرض احوال یوں کیا۔

آپ کو تو معلوم ہی ہے قبلہ! مسجد ٹرسٹ میں آ گئی ہے' میری تنخواہ چھ ماہ سے روک لی گئی ہے' وہ رکا۔ عربی دانی کی وجہ سے اس کے زیر زبر اور مخارج' اردو زبان کی ضرورت سے کہیں زیادہ صحت سے ادا ہوتے تھے۔

پھر اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔

اپنی حاجت اہل محلہ کے پاس لے جاتے یوں ہچکچاتا ہوں کہ مولوی تو پہلے ہی بدنام ہیں' مفت خور اور خیرات' زکوٰۃ پر گزارنے والے۔ وہ بات یہ تھی قبلہ!

آپ میرے بزرگ ہیں' اہلیہ اس وقت دردزہ کی حالت میں ہے' پانچ روپے کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔

وہ اس کو اسی حالت میں کھڑا چھوڑ کر اندر گئے اور آٹھ روپے بارہ آنے اس کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیئے۔

وہ مغموم اور ملول سا کھڑا انہیں دیکھتا رہا' پھر بدقت تمام بولا ''میں انشاء اللہ جلد ادا کروں گا۔''

اس وقت مولوی صاحب نے غور کیا کہ اس کی الجھی ہوئی پریشان ڈاڑھی کے بہت سے بال سفید ہو چکے تھے' اس کی پیٹھ پر ایک مربع پیوند کے علاوہ دامن میں بھی ایک پیوند کا اضافہ ہو گیا تھا' اس کے جوتوں پر گرد تھی' اور اس کے کرتے اور پگڑی کا پیلا پن بتا رہا تھا کہ انہیں فقط سادہ پانی میں کھنگال کر پہن لیا گیا ہے۔

وہ یوں کھڑا تھا جیسے نئی مسجد اسے راس نہ آئی ہو' پھر وہ بوجھل قدموں سے چلا گیا۔

بڑے مولوی صاحب وضو والی چبوتری کے پاس بڑی دیر تک کھڑے رہے جس کی دیواروں پر اب پھر کائی جم رہی تھی مگر انہوں نے اسے نظر انداز کر دیا' پھر وہ ہمیشہ کے سے پرسکون قدموں سے دالان کے اندر گئے' مائیکروفون سے ایک مناسب فاصلے پر کھڑے ہو کر انہوں نے اعلان کیا' اللہ اکبر۔

وضو والی چبوتری کے ساتھ والے گٹھے سے کنیر کی ڈالوں سے گلابی گلابی پھول برستے ہی چلے گئے۔

◆◆◆

اس کا آشوب

سب کے بعد آہستہ آہستہ اپنا رستہ ٹٹولتے ہوئے پھوپا ابا مورچے میں اترتے اور اینٹیں تقسیم کرنا شروع کر دیتے۔ ارے بھئی اینٹ پر بیٹھو اینٹ پر۔ نہ معلوم سول ڈیفنس کی اصولوں کی رو سے ان کی یہ تھیوری کس حد تک درست یا نادرست تھی۔ اینٹیں تقسیم ہو چکتیں' تو مورچے پر چھائی ہوئی بیری کی نیچی نیچی ڈالوں میں سے توڑی ہوئی آدھے آدھے انگ کی خشک لکڑیاں بٹتیں جن کو دانتوں میں دبانا ہوتا تھا۔ اس وقت پورے احاطے میں لے دے کے صرف ایک ہی سول ڈیفنسیا موجود تھا' یعنی غلام محمد ہٹلر کہ جس نے کبھی آغاز پاکستان میں اپنے دفتر کی جانب سے دی ہوائی شہرہ دفاع کی تربیت کی سند لی تھی اور اسے کہیں رکھ کر بھول گیا تھا۔ اور اب جو ہوائی حملے کا سائرن ہوا تھا تو اس کے دانت سے دانت بجنے لگے تھے۔ بہر حال یہ اسی کی نصیحت تھی کہ دانتوں تلے لکڑیاں دبالی جائیں' ورنہ زبان کٹ جانے کا اندیشہ رہے گا۔ لیکن قصہ یہ تھا کہ جوں ہی لکڑی دانوں کے درمیان آتی میری اور شناور کی کھل کھلیاں چھوٹ جاتیں۔ اور یہ کتنی شرم ناک بات ہے کہ اندھیری رات کے سناٹے اور ہو کے عالم میں موت سر پر منڈلا رہی ہو اور انسان کھل کھلا کر ہنس پڑے' بلکہ ہنستا ہی چلا جائے' چنانچہ پھر مجبور ہو کر ہم دانتوں تلے سے لکڑیاں نکال دیتے۔ بھئی دیکھا جائے گا جو ہوگا' فی الحال ہم لکڑیاں نہیں دبا سکتے۔

مورچہ زیادہ تر زنان خانے میں کام دے رہا تھا۔ اس لئے کہ مرد تو بیری تلے بچھی چارپائی پر یا فقط مورچے میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھے رہتے تھے اور اس وقت ان سب کی حس ظرافت بھی پورے عروج پر ہوتی' وہ فقرے سننے میں آتے کہ یوں معلوم ہوتا جیسے مخالف فوجوں کے مابین مشاعرہ ہو رہا ہے اور یہاں ہوٹرز جمع ہیں۔ بیچ بیچ میں پبلک کی تسلی کے لئے اطلاعات بھی فراہم کرتے جاتے تھے۔

''اب یہ ہمارے جہاز اٹھے ہیں۔''

''کھدیڑ رہے ہیں ان کو۔''

''ہماری آرمی ایڈوانس کر رہی ہے ہاں دیکھو توپوں کی آواز سنو' گولہ ادھر کو جا رہا ہے۔'' پھر اچانک ہی سائرن والے سے مخاطب ہوتے ''ابے مرغے کھول دے نا اب۔''

مگر ہمیں یوں ہی لگتا کہ یہ سارے کے سارے جہاز جو ہمارے سروں پر جھپٹتے ہوئے گئے ہیں' ان ہی کے ہیں۔

اچانک میرے دل میں الم ترکیف پڑھنے کا خیال آتا' اور میں اپنے قریب والوں سے فرمائش کرتی ''اچھا تو تم خود بھی تو پڑھو۔'' کسی نے کہا تھا۔

''بھئی میں اس وقت بہت ضروری دعا مانگ رہی ہوں۔'' میں نے کہا اور پھر دعا مانگنے میں مصروف ہو گئی تھی۔

اور جو کوئی اس وقت یہ پوچھ لیتا کہ وہ ضروری دعا کیا ہے۔ میں اب سوچتی ہوں کہ میں نے کتنی خود غرضی اور سیانے پن سے دعا مانگی تھی۔

اللہ میاں اگر کچھ ہو تو میرا سیدھا ہاتھ اور کم از کم ایک آنکھ ضرور باقی رہنے دینا' ورنہ اگر میں زندہ رہ گئی تو پھر لکھوں گی کس طرح۔ اور اللہ میاں میں زندہ بھی رہنا چاہتی ہوں' اس لئے کہ میں لکھنا چاہتی ہوں۔

پھر ہمیں سول ڈیفنس کے ان لکچروں میں جو ہمیں حکماً اٹنڈ کروائے گئے تھے' انسٹرکٹر نے بڑا دہلایا..... یوں ہو جاتا ہے اور ایسا ہوتا ہے پھر یوں کرتے ہیں۔ بال آخر بموں کی اقسام کی باری آئی' فاسفورس بم اور پھر نیپام۔ ہمارے انسٹرکٹر صاحب دہشت انگیزی کے ماہر تھے۔ شاید اس لئے کہ نیپام بم کی تباہ کاریوں اور اس کے انسداد کے ساتھ لگے تختے پر رکھ کر اپنے سیدھے ہاتھ کو بغور دیکھا تھا اور بار بار اپنی تمام انگلیوں کو گنا تھا' اس کے بعد قلم پر دوبارہ انگلیوں کی گرفت کو محسوس کر کے عجیب سی مسرت کا احساس ہوا تھا۔

''ہوں! تو بڑے بدذات ہوتے ہیں' یہ نیپام بم.....''

ساتھ ہی میں نے دوبارہ نوٹس لینا شروع کر دیئے تھے۔

''بڑے بدذات ہوتے ہیں' یہ نیپام بم۔''

مگر اندر سے بار بار یہی چلی آ رہی تھی۔

کون بدذات ہوتا ہے' بم یا بم بنانے والے یا پھر بم باری کا ماحول اور فضا تیار کرنے والے۔ بہر حال انسان لوگ بہت بدذات ہوتے ہیں۔ اور سچ کہا تھا ملائکہ مقربین نے کہ اے پروردگار کیا تو اس انسان کو اپنا نائب بنا رہا ہے جو روئے زمین پر فتنہ فساد پھیلائے گا اور خوں ریزی کرے گا۔

مگر یہ نیپام بم کہ ان کو بنانے والے کو کسی نے بھی نہ یاد دلایا کہ یہ بم روئے زمین پر بسنے والے انسان کو بہت دکھ دے گا اور بہت مسخ کرے گا۔ اور یہ کہ اس کے سلسلے میں ''مگر بعضے'' کا سوال نہ ہوگا۔ ہر بم ایک تباہی اور قیامت کا امین ہوگا' تو کیا نیپام بم اتنا ہی

بدذات ہوگا' اب یہ کچھ ہمارے انسٹرکٹر صاحب کا مذاق دہشت انگیزی بھی ہے کہ دل دہلائے دے رہے ہیں۔ نیپام بم کے متعلق میرے نوٹس ادھورے رہ گئے تھے کہ انسان ایک وقت میں ایک ہی کام کرسکتا ہے یا لکھ سکتا ہے یا پھر نیپام بم کی بدذاتی اور ملائکہ مقربین کی دوراندیشی کے متعلق سوچ سکتا ہے۔

اور پھر سچی بات یہ بھی تھی کہ مجھے انسٹرکٹر صاحب کی بات کچھ اتنی قابل یقین بھی نہیں لگ رہی تھی وہ ضرور مبالغے سے کام لے کر بموں کے متعلق اپنے لیکچر کی اہمیت بڑھا رہے ہیں۔ اور ہمیں ان کی طرف سے بدظن کر رہے ہیں۔ مگر یہ انسٹرکٹر صاحب ان کا مذاق دہشت انگیزی اور نیپام بم یہ سب بہت دور کی باتیں ہیں۔ اتنے دور کی کہ اس وقت کے بعد سے اب تک جنتریوں میں اکائی والے ہندسے دو مرتبہ بدلے جا چکے ہیں اور اس سے پہلے میں نیپام بم کی بدذاتیوں سے قطعی آگاہ نہ تھی۔

اور وہ فروری کے ایک کہر آلود ٹھٹھرے ٹھٹھرے دن کے آغاز کا آخری حصہ تھا جب نیو کیمپس کے خوبصورت اور نئے نویلے ہال کی اسٹیج پر بڑے ضدی پن سے جما وا ''حسام الخطیب'' سامعین سے مخاطب تھا۔ اس کی بلا کی بولتی ہوئی آنکھوں کے سرخ سرخ ڈورے بھیگ سے رہے تھے اور وہ کہہ رہا تھا ''آپ ان آفت رسیدوں کے مصائب و آلام کا اندازہ لگا سکتے ہیں' جو سامیراجیت اور یہودیت کے گٹھ جوڑ کا شکار بنے اور افتادہ خیموں میں اس کلفت اور بے کسی کی زندگی گزار رہے ہیں جس پر بنی نوع انساں کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ فلسطینی عرب ایسی صعوبتوں سے دوچار ہے جن سے تاریخ آدم کا کوئی بھی مظلوم طبقہ اور کوئی شکست خوردہ قوم دوچار نہ ہوگی۔''

ہال کی اگلی تمام سیٹیں ان مندوبین سے پر تھیں جن پر لفظ دانش ور صادق آتا تھا..... اوروں کو تو معلوم نہیں' لیکن میرے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے مندوبین نے بار بار اپنے پیر پھیلائے پھر سمیٹے' جمائیاں لیں اور تیسری مرتبہ مجھ سے فرمائش کی کہ ان کے پس کھڑے رضا کاروں سے پوچھوں کہ یہاں کہیں پان تو نہیں مل جائیں گے۔

تجویز تو خاصی معقول تھی' پان منہ میں نہ ہو تو نہ پڑھنے کا لطف نہ لکھنے کا مزہ' نہ تقریر کا سواد' مگر ہر استفسار پر رضا کار صاحبان بڑی سعادت مندی اور خوش اخلاقی سے اطلاعاً عرض کرتے' جی پان..... پان تو یہاں سے بہت دور جا کر ملے گا' چنانچہ ساری تقریروں کو بے پان ہی جھیلنا تھا' اور پھر اس مقرر کا تو یہ تھا کہ نہایت اڑیل اور نافرمان نکلا کہ اچانک ہی اجلاس کا آغاز ہوتے ہی منتظمین نے (کانفرنسوں کے حسب دستور) وقت کی قلت کا گلہ کرتے ہوئے مقالہ نگاروں سے درخواست کی تھی کہ صرف پانچ پانچ منٹ میں اپنے مقالوں کے خلاصے عطا فرمائیں۔

''چل بھائی میرے یہاں بھی خلاصہ ہی چلے گا۔ غنیمت ہے کہ یہاں شاگردیں موجود نہیں کہ جن کے دلوں میں دن رات خلاصوں کے خلاف حقارت بٹھاتے ہیں ہم۔''

تو خیر اس درخواست یا ہدایات کے سلسلے میں سب سے زیادہ سعادت مند تھائی لینڈ کی مندوب نکلی تھی کہ اس نے اپنے دلچسپ تھائی لباس میں اسٹیج پر آ کر نہایت پتلی باریک آواز میں مروڑیاں کھا کھا کر اور لجا لجا کر سامعین کو مطلع کیا کہ اس کا ملک ایک حسین اور سیاحت کے قابل جگہ ہے اور یہ کہ آپ حضرات تشریف لائیں' اور یہ کہ وہ تو اسٹیج پر چڑھتے ہی یہ گل افشانی فرمائی کہ ہوا کرے وقت کم' بات یہ ہے کہ نہ مجھے روز روز سامعین ملیں گے اور نہ آپ یوں روز روز صبر سے بات سننے کے موڈ میں ہوں گے لہٰذا اب میں ہوں اور اسٹیج چنانچہ وہ اللوہ کا بندہ اسٹیج پکڑ کر کھڑا ہو گیا' اگرچہ بیچ بیچ میں وہ یہ بھی تسلی کرواتا رہا تھا کہ میں اپنا پورا پیپر نہیں پڑھ رہا لہٰذا اللہ سے اچھی امید رکھیں۔

''برادران دانش و قلم!''

مہمان مندوب اپنی تقریر کا آغاز کیا۔

مگر برادران دانش و قلم تو اس کی نافرمانی پر پہلے ہی برگشتہ ہو چکے تھے۔ کم سے کم میرے قرب و جوار میں بیٹھے ہوئے میزبان مندوب کہ انہوں نے بار بار پیر پھیلانے اور سکیڑنے کا عمل شروع کرنے کے علاوہ' پان کی کمی کو بھی شدت سے با آواز بلند محسوس کرنا شروع کر دیا تھا اور میں بھی خاصی بور اور بددل تھی کہ ادھر سے ادھر نظریں دوڑا رہی تھی۔ میرے اس طرف مشرقی پاکستان کے صحافیوں کا گروپ تھا اور بنگالی بھائی کا یہ ہے کہ وہ آپ سے خواہ کتنا ہی ناراض کیوں نہ ہو' لیکن اس کے چہرے کا رکھ رکھاؤ ایسا برقرار رہے گا کہ معلوم ہو جو کچھ آپ نے کہا اس نے پلو میں باندھ لیا' اور یوں اگلا اپنی بے دلی اور طبیعت کے اچاٹ پن اور شرمشار ہوتا ہے چنانچہ میں نے اپنے دائیں اور بائیں بیٹھے پان سے محروم مندوبین کے دلچسپ فقرے بازی سے لطف لینا شروع کیا۔

ہم تو سمجھتے تھے کہ پاکستانی بھائی ہی عقل مند ہوتا ہے' مگر یہ عرب تو ہم سے بھی عقل مند نکلے۔

''چڑھ گیا ہے بانس میرا یار۔ اب اترنا مشکل ہے آپ دوسروں کے فقرے سنتے رہئے' تو آپ کی رگ ظرافت بھی کام کرنے لگتی ہے۔''

چنانچہ میں نے بھی سوال کیا' کچھ معلوم ہے' یہ اب کون سی صدی لگ گئی ہے۔

''ارے بھئی پان کا انتظام کراؤ' تم تو لاہور والی ہو۔'' اب میں پان کہاں سے منگواتی مجبوراً منہ پھیر کر مقرر کی طرف متوجہ ہونا پڑا

اور پہلی بات تو یہ تھی کہ مجھے یہ عربیائی ہوئی انگریزی بہت دلچسپ اور شیریں معلوم ہوئی۔ جی چاہا کہ میں بھی ایسے ہی تر تر انگریزی بولنا شروع کر دوں' اور ساتھ ہی میرے کانوں نے سنا۔

''اب سوال یہ ہے کہ اس قوم کی بھوک' مصائب اور خانماں بربادی کا ردعمل کیا سوچا گیا ہے کبھی کسی نے یہ بھی سوچا کہ کچلی ہوئی انسانیت کی کراہوں اور نخچیروں کے منتشر اعضا پر قومی عافیتوں اور امن عالم کے قصر کس طرح کھڑے ہو سکیں گے۔'' اور اس کے بعد میں اپنے دائیں بائیں بیٹھے پان سے محروم مندوبوں کے دلچسپ فقرے نہیں سن سکی تھی اور یہ ہو سکتا ہے وہ خاموش ہی بیٹھے رہے ہوں اور اس آدمی کی بات سن رہے ہوں جس سے وہ آغاز تقریر میں برگشتہ ہو گئے تھے۔

خوب صورت زبان اور بندشوں سے مرتب اس مقالے کا لکھنے والا خود ادیب تھا اور فلسطین کے المیے کے عربی ادب پر اثرات بیان کر رہا تھا۔

کیمپس کے ہال سے نکل نکل کر لوگ جانے لگے تو وہ اتفاقاً میرے برابر سے ہو کر گزرا۔

''اے بھئی آپ مجھے اپنا یہ پیپر پڑھنے کو دیں گے۔''

وہ تو جیسے خدا سے چاہتا تھا کوئی اس کے پیپر لو لفٹ دے' چنانچہ اس نے نہایت مستعدی سے یہ وعدہ کیا کہ ہوٹل پہنچ کر وہ مجھے ایک نہیں کئی نقلیں دے دے گا۔

چنانچہ جب میں تھنکرز فورم کی برپا کی ہوئی افریشیائی کانفرنس (جسے وہ افریقین کہہ رہے تھے) کے شام کے اجلاس میں شرکت کرنے گئی' تو وہ مجھے راہداری ہی میں مل گیا اور اس نے مجھے روک کر اپنا مسودہ دیا۔ شکریہ کہتے ہوئے مجھے ایک بات یاد آ گئی۔

''مجھے ایک بات اور پوچھنا تھی۔''

''یہ قصہ کیا ہے بھائی! فلسطین کا قصہ نہ جانے کب سے سنتے چلے آ رہے ہیں۔''

''یہ لمبا قصہ ہے' اگر تمہیں واقعی دلچسپی ہو' تو میں بتانے کو تیار ہوں۔'' وہ بات کرتا ہوا راہداری سے نکل کر برآمدے میں آ گیا تھا۔

باہر لان پر کئی دن بعد دھوپ چمکتی نظر آئی تھی۔

پہلے تو کچھ واجبی سی تھی مگر تمہارے پیپر نے کچھ زیادہ کر دی ہے..... میں اس دھوپ کی تلاش میں چلتی ہوئی لان کی طرف بڑھنے لگی اور وہ بھی میرے ساتھ لگا چلا آیا تھا۔

پھر میرا خیال ہے کہ اگر ہم یہیں گھاس پر بیٹھ جائیں' تو اطمینان سے بات ہو سکے گی اور وہ جھٹ خالص ہم لوگوں کے انداز میں گھاس پر پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ اگر تم نے بیٹھ کر میری بات نہ سنی' تو پھر سرسری طور پر سنتی ہوئی کسی اور طرف کو یوں نکل جاؤ گی جیسے ابھی راہداری سے چلتی چلتی تم یہاں تک آ نکلی ہو۔

چنانچہ مجھے بھی گھاس پر اس طرح بیٹھنا پڑا کہ پہلے اپنے کوٹ کا دامن بچھایا اور پھر اس پر تشریف رکھی۔

اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لمبا اور موٹا سا سگار نکالا۔

ارے ایسا سگار تو میں نے اپنے دادا کو پیتے دیکھا تھا اور اس کے بعد کبھی نظر ہی نہ آیا۔ مگر ہاں کبھی کبھی نانا ابا بھی پیا کرتے تھے۔ سنہرا پن لئے ہوئے بھورے بھورے سگار کو دیکھ کر مجھے بھولی بھولی سی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اور وہ بڑے اہتمام سے اس کو سلگا رہا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک وہ میرا دماغ چاٹتا رہا تھا' ایک عجیب سی ٹھہری ٹھہری اور روٹھی روٹھی آوازیں مسلسل بولتا رہا تھا اور بولتے وقت اس کی آنکھوں میں اتنا دکھ اور چہرے پر اس قدر کرب تھا کہ میری آنکھیں بھر آئی تھیں۔

اللہ! دنیا میں کچھ لوگ اتنا دکھ بھی اٹھا رہے ہیں' مجھے نہیں خبر تھی۔

مگر حسام الخطیب سے میں نے یہ کہا تھا:

''اے بھائی تو کب تک خیموں میں مہاجر بنے پڑے رہو گے۔''

''تو پھر کیا کریں۔''

''کریں کیا' بس جاؤ جہاں کہیں پڑے رہو۔''

''مگر ہماری آئندہ نسلیں یہ جو بھول جائیں گی کہ ہمیں اپنے وطن واپس جانا ہے۔''

''ارے تو جب تم سرکاری نوکریاں بھی نہیں کرتے تو کھاتے پیتے کہاں سے ہو؟''

''بس صحافت معلمی اور کاروبار کرتے ہیں۔''

عجیب لوگ ہیں۔ میں سوچتی رہی تھی۔

''تو تم لوگوں کو فلسطین کے متعلق کچھ علم نہیں؟''

''نہیں معلوم کیوں نہیں' خوب معلوم ہے کہ کوئی بہت زبردست گھپلا ہے جب ہی تو حکومت نے اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا ہے۔''

اچھا' اس کے بعد ہم لوگوں کو اٹھ کر اپنے اپنے گروپ کی میٹنگ میں جانا تھا چنانچہ زور شور سے میٹنگیں ہوتی رہیں جن کے نتیجے میں ہونا ہوانا کچھ بھی تو نہیں تھا چنانچہ میں اپنے لسانی گروپ میں بیٹھی ہزا یکسی لینسی' ڈاکٹر خلف اللہ ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر صورت گر کی تقریریں اور تجویزیں سنتی اور بور ہوتی رہی' اور وہ نہ جانے کس گروپ میں بیٹھا سگار سلگا سلگا کر اپنے فلسطین کا مسئلہ پیش کرتا اور اس سلسلے میں ہمدردیاں سمیٹنے کی کوشش کرتا رہا ہوگا۔

میری توقع کے خلاف میرا گروپ سب سے فضول نکلا اس لئے کہ ساری تقریروں کا ماحصل صرف اتنا ہی نکلتا تھا کہ لوگ اپنے اپنے ملکوں اور علاقوں کے لسانی اختلافات اور مسائل بیان کر کے ایک دوسرے کا منہ دیکھنا شروع کر دیتے تھے۔ کچھ کا مسئلہ یہ تھا کہ سوسوز بانیں ایک دوسرے کی کاٹ میں مصروف تھیں اور کسی کا مسئلہ یہ تھا کہ زبان کا کوئی جھگڑا اور مسئلہ سرے سے موجود ہی نہ تھا کہ جیسے ڈاکٹر خلف اللہ تھے کہ ان کے یہاں فقط ایک ہی زبان چلتی ہے۔

ارے بھئی میں کس چکر میں آ گئی ہوں' میں بار بار پچھتائی' اتنے جید اور جگادری قسم کے ڈاکٹروں کے درمیان پھنس جانا بھی ایک قیامت ہے کہ وہ اعداد و شمار سننے میں آ رہے تھے کہ دماغ ٹھسا ٹھس بھر گیا تھا۔ لسانی اسٹیٹسٹکس سے ڈرتے ڈرتے ایک ہی بار زبان کھولی تھی۔

''کہ بھی اصل مسئلہ حل ہونے ہی پر دوسری دوریاں ختم ہوں گی۔''

مگر ہماری کمیٹی کی صدر صاحبہ نے ایک ایک ملک کی منسٹر ہونے کی بنا بہت کاروباری اور ذمہ دار تھیں' ایسی باتوں کو گھاس نہیں ڈالی' چنانچہ ہزا یکسی لینسی نے کاروائی کو یوں لپیٹا اور تہہ کیا کہ ایک مرتبہ سارے ڈاکٹر حضرات کی باتوں اور تجویزوں کا خلاصہ پیش کیا اور فٹافٹ میٹنگ کی برخواستگی کی اطلاع دے دی۔ میں نے چونک کر دیکھا تو انجم صاحب کا سگریٹ جل جل کر ان کی انگلیوں کی درمیانی جھری تک پہنچ چکا تھا اور راکھ ان کے سوٹ پر بکھر رہی تھی جس سے وہ مطلق باخبر نہ تھے' البتہ مجھے ضرور افسوس ہوا تھا کہ کام کی ایک بات بھی نہ ہوئی اور ان بچاروں کا سگریٹ مفت ہی میں رائگاں گیا۔ تو شاید ایسی ہی کچھ کارروائیاں دوسری کمیٹیاں بھی کر رہی ہوں گی۔

مطلب کی بات تو یہ تھی کہ جمعے کی دوپہر کا کھانا شاہی قلعے میں تھا۔ افوہ۔ یعنی ہم اور قلعے میں خاصہ تناول فرمائیں۔ ہم سے میرا مطلب فقط اپنی ذات تھی' مگر حادثہ یہ ہوا کہ میز کے جس کونے پر بیٹھی اس طرف عرب ملکوں کے علاوہ بھارتی اور نیپالی مندوب تھے' مگر میرے چاروں طرف یا سیدی یا سیدی کا زور تھا۔ میں تھوڑا سا سٹپٹائی تھی۔ یوں کہ میں نے کسی کو کہتے سنا تھا کہ یہ بے چاری تو اتنی اکسائٹڈ ہے کہ صرف غیر ملکی مندوبوں ہی سے بات کئے جا رہی ہے۔ (اشارہ اسی لان پر بیٹھ کر سنی جانے والی بات کی طرف تھا) میں نے سوچا اگر انہوں نے اب پھر مجھے اس پوزیشن میں دیکھا جو بالکل اتفاقی طور پر بن گئی تھی' تو ان کو میرے مزید اکسائٹمنٹ کا خیال

کر کے کتنا دکھ ہوگا' مگر اب تو میزبان مندوب کی حیثیت سے ان کی دیکھ بھال کرنا ہی تھی۔ سب سیدی بڑے شوق اور رغبت سے ہر کھانا کھا رہے تھے بجز ایک بوڑھے السیدی کے پیچش کے پرانے مریض ہونے کی بنا پر مرچوں سے روٹھے بیٹھے تھے اور ان کا خیال تھا پلاؤ اور فیرنی میں بھی مرچیں ڈالی گئی ہیں' چنانچہ انہوں نے یہ کیا کہ باقی کے السدیوں کو مرچوں کے خلاف ورغلانا شروع کر دیا۔ اور خود فقط دہی کھانے پر اکتفا کرتے رہے اور باقی کے السیدی یہ کر رہے تھے کہ بظاہر تو انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا تھا مگر ان کی نظر بچا بچا کر ہر ایک چیز نوش فرماتے رہے۔

پھر میری نظر اس پر پڑی۔ اس نے بڑے میاں کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اور سیخ کے کباب اپنی پلیٹ میں رکھ لئے۔ چھری کانٹا ایک طرف سرکا دیا اور ہاتھ سے کباب کھاتے کھاتے مجھ سے پوچھا ''میرا مقالہ پڑھ لیا؟''

''ابھی کہاں' فرصت سے پڑھوں گی۔ ایسی کیا جلدی ہے۔''

دراصل میں نے اب تک اس پر سرسری سی نظر ڈالی تھی۔ اس نے مایوسی سے سر جھکا لیا اور کباب سے لپٹے ہوئے ڈوروں سے الجھتا رہا۔

اور میرے کانوں میں اس کے مقالے میں دیئے ہوئے ہاروں ہاشم کی نظم کا ایک اقتباس گونجنے لگا۔

''میں تو اسی وقت خطا کار ہو گیا تھا جب میں نے
آوارہ وطن ہونا قبول کیا۔
میری تقصیر تو یہی تھی کہ میں نے
ظلم کا مقابلہ نہیں کیا۔
میرا سب سے بڑا جرم یہی ہے۔
کہ موت نے مجھے للکارا مجھ سے التجا کی اور میں اس کی آواز پر لبیک کہے بغیر بے اعتنائی سے چلا آیا۔''

تو کاہے کو چلے آئے تھے' واقعی مر گئے ہوتے۔ میں نے پھر سوچا مگر یہ بے چارہ خود کاہے کو آیا ہوگا اپنے افتاں و خیزاں بے خانماں ماں باپ کی انگلی تھامے کشاں کشاں' گیا ہوگا۔ کھانا ختم ہوا تو لوگ باگ ٹولیوں میں بٹ کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے کچھ لوگ شکیت الاموی کو لے کر شاہی مسجد چلے گئے۔

آسمان پر ہلکے ہلکے بادل آئے ہوئے تھے اور میں ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔ مجھے حلقے والوں کی تلاش تھی کہ قاعدے کی رو سے مجھے ان ہی کے قریب رہنا چاہئے تھا کہ اکیلے اکیلے چلتے ہوئے تنگ پاجاموں پر اونچے اونچے گلوں کے کرتوں میں بے حد مدبر

نظر آنے والے نیپال کے اندراج اور نارائن سریش آ کر ٹھہر گئے۔ پھر ہم لوگ قلعے کے اس حصے کے متعلق باتیں کرنے لگے کہ پیچھے سے آواز آئی۔

''یہ دھاندلی ہے' تم دونوں دو مختلف ملکوں سے تعلق رکھتے ہو اور ایک ہی زبان بول رہے ہو۔''

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا حسام الخطیب اور اس کے ساتھی کھڑے تھے اور اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

''بات یہ ہے کہ میں تمہاری زبان نہیں بول سکتا اس لئے شاید میں تم پر فلسطین کا مسئلہ واضح نہیں کر سکا۔''

''ہاں اسی لئے تو کہتے ہیں کہ تم ہماری زبان سیکھو!''

''کس طرح سیکھیں؟''

''کیوں کیا تمہاری زبان مرچیں کھائے بغیر نہیں سیکھی جا سکتی۔''

''ہاں جب ہم طوطے کی باتیں کرنا سکھاتے ہیں تو اس کو خواب مرچیں کھلاتے ہیں۔''

اندراراج اور اس کا ساتھی ہنس پڑا تھا۔

''بھائی تم بھی ہنسا کرو نا' یہ کیا میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے ایک فکر کے عالم میں منہ لٹکا ہی رہتا ہے۔ اب ایسا بھی کیا تمہارا مسئلہ ہے آ کچھ تم نے اپنے ذہن پر مسلط بھی کر رکھا ہے۔''

''اچھا تو تمہارا خیال ہے۔ یقین کرو..... کیا نام ہے تمہارا' میں نے نام تو پوچھا ہی نہیں۔'' وہ رکا میں نے نام بتا دیا۔

''عربی ترکیب ہے تمہارے نام کی۔''

''ہاں واقعی؟''

''ہاں تو فاطمہ میں یہ کہہ رہا تھا (اب وہ اور بھی روہانسا اور دل گرفتہ ہو گیا) لوگوں کا ی حال ہو کہ کسی بھی سرزمین پر حقوق داخلہ حاصل کرنے سے سکیورٹی افسروں کیشک وشبے اور بے شمار سختیوں کا شکار بنتے ہوں اور پھر کئی کئی راتیں طیارے میں قید گزار دیتے ہوں کہ اب وہ طیارہ ان کو اس ملک سے اڑا کر کسی اور سرزمین پر لے جائے جہاں ان کے داخلے پر اس درجہ شک وشبہ نہ کیا جائے' اس قوم کے افراد کہاں تک بے فکری سے ہنس سکتے ہیں۔''

''ہائیں کیا مطلب تمہارا؟''

پھر وہ بڑی دیر تک کھڑا فلسطینی مہاجروں کی ان دقتوں اور بے شمار الجھنوں کا ذکر کرتا رہا جن کا ان کو کسی دوسرے ملک میں داخلے

کے وقت سامنا کرنا پڑتا ہے۔

وہ کچھ ایسے لفظوں میں بات کرتا تھا کہ مجھے اس سے پوچھنا پڑا۔ ''تم شاعری کیوں نہیں کرتے؟''

''شاعری ہاں میں کبھی کبھی نظم لکھتا ہوں' لیکن مجھے احساس ہے کہ مجھے شاعری دے سورر ہنا چاہئے۔''

''کیوں؟''

اس لئے کہ میں خطیبوں کی اولاد ہوں۔ خطیبوں کو کچھ پابندیوں اور اصولوں کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ میں نثر لکھتا ہوں۔''

''ن ورت سے وتم ذرا بھی خطیب نہیں لگتے۔''

''مگر میرا بھائی پروا نہیں کرتا اور وہ برابر لکھتا رہتا ہے۔ میں نے اپنے مقالے میں اس کی نظموں کے اقتباس بھی دیے ہیں'' میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا اس کی آنکھوں میں دکھ اور فکر مندی کے چشمے سے پھوٹ رہے تھے۔

کیا اس کی ساری قوم کی آنکھوں میں اتنا ہی آشوب اور چہروں پر اتنی ہی فکر مندی ہے؟ پتا نہیں کیوں میرا دل ڈوب سا رہا تھا دکھ کے اس اتھاہ ساگر کے تصور سے جو اس پوری قوم کی روح کے اندر موجیں مار رہا ہوگا۔ قلعے کی فصیل کے قریب کھڑے کھڑے مجھے یوسف الخطیب کا وہ اقتباس یاد آ رہا تھا جو کل رات میں نے اسکے مقالے میں پڑھا تھا۔

''ہمدم کیا تم بھی وقت کے ہاتھوں برباد ہو؟

کیا تمہارا بھی خطرات' سیاہ راتوں اور آشوب سے سابقہ ہے؟ تمہارے ان نینوں میں میرے دیس نے ابھی ابھی اپنی جھلک دکھائی ہے۔ تمہاری اداسی میرے آشوب سے کتنی مشابہ ہے۔ میرا قلب فگار' میری داستان' میری بے خانمائی اور میرا کرب۔

اپنے گاؤں کے کھیتوں کے ایک تنکے کی حسرت دید میں بے قرار ہے۔

تم نے آتی بار اسے اپنے شہ پر اور دل کے درمیان کیوں نہ چھپا لیا۔ آہ میرا دل! مثلث اور صفا کی پہاڑیوں کی ریت کے دو ذروں کے لئے تڑپتا ہے۔

ایک ہاتھ میں گھاس کا ننھا سا ایک پودا اور دوسرے میں سفید سوسن کا ایک گچھا۔

ہمدم میرے وہ تحفے کدھر گئے۔

جو تم گھر سے آتی دفعہ لائے تھے۔

''کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تم میری ہی طرح مجبوری اور درد و کرب کے سوا کچھ بھی نہیں لائے۔''

بوندا باندی شروع ہوگئی تھی۔ اندراج اس کا ساتھی ہم سے ذرا ہٹ کر آپس میں باتیں کرنے لگے تھے۔ میں نے فیصل پر سے جھانک کر دیکھا' ہمیں پارک لکشری واپس لے جانیوالی گاڑیاں تیار کھڑی تھیں۔ پھر ہم نیچے اتر آئے۔ پھر جب ساری کمیٹیاں خوب خوب میٹنگیں کر چکیں' تو کھلے اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی اور اس دفعہ میں نے اپنے حلقے والے مندوبین کی رسی کو مضبوطی سے تھام ہی لیا تھا' چنانچہ ہم لوگ کافی پیچھے بیٹھے تھے۔

اور چونکہ مجھے خوب اندازہ تھا کہ اس کھلے اجلاس میں بھی وہی کچھ ہونا ہے جو بند اجلاس میں ہوا تھا اس لئے اب ساری کارروائیوں سے بے نیاز ہو کر مندوبین کے سوٹوں اور حلیوں کو تاڑنا زیادہ دلچسپ کام معلوم ہو رہا تھا' چنانچہ یہ نہ معلوم ہو سکا تھا کہ بات کیا تھی اور کس نے اٹھائی تھی' مگر یہ دیکھنے میں آیا کہ حسام الخطیب کسی بات پر بری طرح اڑا ہوا تھا اور مستقل ضد کئے جا رہا تھا اور ذمہ دار حضرات خاصے سٹپٹائے سٹپٹائے سے نظر آ رہے تھے۔

پھر وہ اڑیل پن! میں نے سوچا اور وہ بار بار اٹھتا جھک کر' پھر بیٹھ کر اپنا سگار نکالتا' نہایت اہتمام سے جلاتا چند کش لگاتا کہ پھر اس کو اٹھنا پڑ جاتا' تو وہ سگار کو بڑی احتیاط سے بجھا کر جیب میں رکھتا اور اٹھ کر ضد کرنے لگتا۔

بات فقط اتنی تھی کہ وہ مذمت کروانا چاہ رہا تھا اور کس کی؟ امپیریلزم کی سامراجی گٹھ جوڑ کی اور اہل نظر تھے کہ ایک فقط اس مسئلے کے لئے ایسی طلاقہ حرکت سے گریز ہی کر رہے تھے۔

میرا جی چاہا کہ اس سے کہوں۔ اے بھائی بیٹھ جاؤ یہ منہ زبانی مذمتوں سے کیا بنے گا۔۔ جو کچھ کرنا ہے نہایت گھٹنے پن سے کرو گے تو کام چلے گا۔

اچانک میری نظر ڈاکٹر ملک راج آنند اور دوسرے بھارتی مندوبین کی طرف گئی اور جو کوئی اللہ کا بندہ اس کی حرص میں کشمیر کا مسئلہ لے کر کھڑا ہو گیا' تو پھر ڈاکٹر آنند سے مروت رکھنے والے مندوبوں کا کیا بنے گا۔ میں نے اتنا سوچا ہی تھا کہ اپنے بٹالوی صاحب نے کھڑے ہو کر کشمیر کا ٹکڑا لگا ہی دیا' مگر وہ بھی رائگاں گیا تھا۔ شاید بہر حال منہ دکھیارے کا لٹکا ہوا تھا۔

دوسری صبح بسفر سلامت روی والی صبح تھی۔ مندوبین کے بوریے بندھ رہے تھے کہ اچانک راہداری سے باہر فضا میں مظاہرے کی سی بو باس محسوس ہوئی اور سب نے لپک کر شیشوں کے اس طرف دیکھا۔

ایک ٹوٹا پھوٹا خستہ حال گروپ چند پلے کارڈ اٹھائے کشمیر کے مسئلے کو مندوبین پر واضح کرنے آیا تھا۔

مگر وہ مظاہرہ کرنے والی پارٹی حسام الخطیب ہی کی کشتی میں سوار ہوئی کہ زیادہ تر مندوب ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تبادلہ خیال

کرتے رہے' بجز چند عرب مندوبوں کے جو شیشوں سے جھانکتے ہوئے ان کے نعروں پر غور کر رہے تھے۔ مظاہرہ کرنے والوں کی کتعداد اور پھر غیر موثر مظاہرے پر نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک بار پھر میرا دل چاہا کہ ان سے بھی کہوں۔

''کم بختوں! کیوں مظاہرے کرتے ہو کیوں مذمتیں کرواتے ہو۔ تمہارا مسئلہ فقط تمہارے لئے اہم ہو سکتا ہے۔''

لوگ اندر سے باہر اور باہر سے اندر آ جا رہے تھے۔ ایک طرف فیض صاحب اور ڈاکٹر آنند باتیں کر رہے تھے شیشوں سے چپک کر مظاہرہ کرنے والوں کا نظارہ کرنے والوں میں جو شخص سب سے آخر میں ہٹ کر آیا' وہ وہی تھا۔

''معلوم ہے یہ کون لوگ تھے۔''

''ہاں معلوم ہے۔''

''پھر تم بھی تو ان کے مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''کوشش؟ مجھے احساس ہے اس مسئلے کو ہم جیسے ہی سمجھ سکیں گے۔''

چلنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر اس نے اپنے اطمینان کے لئے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا واقعی تم میرا مقالہ ترجمہ کر دو گی۔''

''یہی نہیں بلکہ جب بھی اور جتنا بھی مواد اس موضوع پر مجھے ملے گا وہ بھی کر دوں گی۔''

''میرا خیال ہے میں نے کچھ نہ کچھ تو اپنا مسئلہ تم پر واضح کر دیا ہے۔''

''حسام الخطیب!'' میں نے پہلی بار کہا تم بار بار اس مسئلے کو فقط اپنا مسئلہ نہ کہو' یہ میرا مسئلہ بھی ہے ممکن ہے اس بات کی پبلسٹی نہ ہو سکی ہو' مگر ہم جانتے ہیں کہ یہ ہمارا بھی مسئلہ ہے اور تم سمجھتے ہو یہ مسئلہ تم نے مجھ پر واضح کیا ہے تو یہ تمہاری غلطی ہے۔ مجھ پر یہ مسئلہ میری ماں نے اس وقت واضح کر دیا تھا جب مجھے یہ علم بھی نہ تھا کہ مسئلہ کس کو کہتے ہیں' سامراج کیا ہے اور مشرق مغرب کا کیا قصہ ہے۔ اس نے بار بار راتوں کو اپنے کہنی کے بنائے زاویے میں رکھے ہوئے میرے سر کو سہلاتے ہوئے فلسطینی عربوں کی خانماں بربادی کی کہانی سنائی تھی اور کیا تم یقین کرو گے کہ یہ باتیں کرتے کرتے اس کی آواز بھی یوں ہی گلوگیر ہو جایا کرتی تھی جیسے تمہاری.....''

وہ خاموش کھڑا رہا۔

اب سمجھے نا تم! بات فقط اتنی تھی کہ میں سوچتی تھی کہ یہ تو ایک جذباتی عورت کی کی ہوئی بات ہے جو بخدو حجاز کا ذکر کرتی ہے تو اس کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور کبھی چمکنے لگتی ہیں میرے بھائی تم نے تو فقط اس کی کی ہوئی باتوں کی تصدیق کی ہے اور اب مجھ پر ان

باتوں کی صداقت آشکار ہو چکی ہے۔

اس کے بعد اس نے کچھ نہیں کہا' بڑے اطمینان سے خدا حافظ کہا اور اپنا سامان پیک کرنے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا' لیکن قطعاً خبر نہ ہوئی کہ وہ درحقیقت اپنا آشوب میرے حوالے کر گیا ہے۔

اور یہ سب بات بہت پہلی کی ہے اب جنتری کا سنہ دو ہندسے آگے بڑھ چکا ہے اور اس کے بعد سے نئی نئی باتوں کا سلسلہ چل پڑا ہے۔ یعنی تاریخ کے حوالوں میں ایک اور حوالے کا اضافہ ہوا جس کے نتیجے میں نیپام بم کے وجود سے آگاہ ہوئی اور پھر پلک جھپتے پانچ جون بھی آ گئی کہ جس نے نیپام بم کی بدذاتیوں کی گواہی دی۔

نیپام بم کہ جو انسان کو بہت دکھ دیتا ہے اور بہت مسخ کرتا ہے۔

پھر میرا جی چاہا کہ انسٹرکٹر صاحب کو آواز دوں اور پوچھوں کہ تم نے ''نیپام بم'' کی تباہی اتنے سادہ اور بے جان لفظوں میں کیوں بیان کی تھی' تمہارا بیان تو حقیقت سے بہت دور رہ جاتا ہے اور جب ہی مجھ پر یہ حقیقت پہلی مرتبہ آشکار ہوئی کہ افریشیائی کانفرنس کا وہ اڑیل ڈندوب جس کی آنکھوں میں ہر گھڑی دکھ کا ساگر ابلتا تھا' مجھے اپنے آشوب کا امین بنایا گیا تھا۔

اور یہی وہ حادثہ ہے جس نے مجھے بعض لوگوں کے روبرو شرمسار کیا ہوا ہے۔ وہ ہنستے ہیں کہ میں بہت جذباتی ہوں اور پانچ جون اور اس کے بعد کے واقعات نے مجھے اس لئے سراسیمہ کیا کہ کچھ علاقے کچھ لوگوں کے ہاتھ سے نکل کر کچھ اور ہاتھوں میں پہنچ گئے۔

اور پھر یہ کہ وہ لوگ اس کے اہل بھی نہ تھے وہ ان کی عسکری نااہلی اور بدنظمی کا ذکر کرتے ہیں۔ ایسے ہنسنے والے شرمسار کرنے کے لئے نااہلوں کے مقابلے میں ظفرمندوں کی دانش و تدبر پر تبصرہ کرتے اور میرے گھٹیا اور عامیانہ جذبے کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن مجھے ان سے شکوہ نہیں۔ بدقسمت اور آوارہ وطن فریق اور شکست خوروں سے ہمدردی کا نتیجہ شرمساری اور حقارت ہی کی شکل میں ملتا ہے' اس لئے کہ اب میں ان کو یہ بھی تو بتا نہیں سکتی کہ کچھ علاقوں کا کچھ لوگوں کے ہاتھ سے نکل جانا تاریخ کا اتنا نیا حادثہ نہیں کہ لوگ سراسیمہ اور حواس باختہ ہوں۔

اصل حادثہ تو یہ ہے آج ایک بار پھر یہود کے شہریت اللحم میں مسیح ناصری مصلوب ہوا ہے۔

ہاں یہ اطلاع درست ہے باہر بار جب کوئی مظلوم سردار چڑھے گا جب کسی آوارہ وطن کے پیروں کے چھالوں میں کانٹے چبھیں گے جب ہی مسیح ناصری مصلوب ہوگا۔

اصل حادثہ تو یہ نیپام بم تھا جس نے ان بے شمار آنکھوں کو مہیب بدرونق بنا دیا ہے جن میں دکھ کے اتھاہ ساگر ابل ابل کر انہیں اور

بھی خوب صورت بنا دیا کرتے تھے۔

میں ان سے نہیں کہہ سکتی کہ آج میں نے حسین کو ایک بار پھر خاک و خوں گشتہ دیکھا ہے' ج اردن کے شہروں اور عمان کی گلیوں میں زین العابدین پھر پا بجولاں آیا ہے۔

کیا اگر ان سے کہا جائے تو وہ یقین کر سکیں گے ک میں نے تو نیپام کی تباہ کاریوں کا سن کر اپنے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کو بار بار گن کر اپنا اطمینان کر لیا تھا کہ نیپام بم سے ہم دو چار نہ ہوئے تھے' مگر اس شاعر کی انگلیوں اور آنکھوں کی ضمانت کس کے پاس ہے جس نے ایک فلسطینی مہاجر کے دکھ کی داستان یوں لکھی تھی۔

''یہاں
ہول ناک صحرائی سرزمین میں
جہاں تقدیر ٹھوکریں کھاتی
اور ابلیس واویلا کرتا ہے
ابر سیاہ کی گرج کے بین بین
میں نے افعی مرگ کی پھنکار کو سنا
وہ میرے اپنے پھیپھڑوں میں سر چھپائے بیٹھا
تب دق کے داغ کو
اپنے سردار اور منجمد کنڈل کے محیط میں لے رہا ہے۔
یہاں اس خیمے کی نقلی زندگی میں آ کر
میری بے در و دیوار پناہ گاہ کو دیکھو
آؤ نا بھائی دیکھو تو
مجھے یہاں مقدار کی ٹھوکروں پر لا کر ال دیا گیا ہے بگولوں کی اذیتیں جھیلنے اور خاموش اور پر وقار رات میں اشک ریزی کرنے کو۔''

چنانچہ اصل حادثہ تو یہ ہے کہ ابھی ایک نسل کے آنسو خشک نہ ہوئے تھے کہ ایک دوسری نسل سدا بہار نقصان اذیت کے غاروں میں دھکیل دی گئی۔

لیکن یہ بات بھی سچ ہے اور کہنے والے کچھ جھوٹ نہیں کہتے کہ ایسا تو ہوا ہی کرتا ہے اور دنیا اسی کا نام ہے اور یہ تو کفران نعمت ہے کہ ہم اپنی عافیتوں میں دوسرے کے آشوبوں کو درانے کا موقع دیں اور ناحق ہی بے چین ہوں۔

دراصل میں بھی یہی چاہتی ہوں' اب کہ موسم بدل رہا ہے اور سہانے پن کی طرف مائل ہے اور میں نے ابھی ابھی بالکنی میں آ کر آسمان کی طرف دیکھا ہے۔ اس کی نیلاہٹوں پر بادلوں کا بھورا اور کہیں کہیں سیاہی غالب آ رہی ہے۔ شہر کے چراغ جگمگا رہے ہیں۔ گرجا کی پچھلی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے سفیدے' بکائن اور سرس کے پیڑ دھیرے دھیرے سے جھوم رہے ہیں۔ بالکل سامنے والے احاطے میں بوڑھی دھوبن کو کوٹھڑی میں لالٹین کی روشنی میں بڑے سکون سے کھانا پک رہا ہے' تو ایسے میں میں ان بہت سے بے چراغ گھروں کو اپنے ذہن سے نکال دینا چاہتی ہوں' جو کچھ لوگوں کے ہاتھوں سے نکل کر کچھ اور ہاتھوں میں پہنچ گئے ہیں' جن کے چولہے ٹھنڈے پڑے ہوں گے اور ان گلیوں میں ان بچوں کے کھیلنے اور شور کرنے کی آوازیں نہیں آ رہی ہوں گی جنہوں نے ان ہی گلیوں کے پیچ وخم میں جنم لیا تھا اور جو وہیں پروان چڑھے تھے۔ میں اچھے موسم سے لطف اندوز ہونے کی خاطر عمان کی سڑکوں پر ادھر ادھر بے خانماں لوگوں کے ڈیروں کو بھول جانا چاہتی ہوں اور مہاجرین کے ان کیمپوں کو جہاں آدمی پر آدمی ٹوٹ رہا ہے' دھوپ ہے' جلن ہے' زخم اور بھوک ہے جہاں مکسراتا ہوا بے فکر انسان چڑچڑے اور کینہ پرور انسان میں بدل رہا ہے' آنسوں ہیں' نفرت ہے اور جسموں کے پسینوں کی اٹھتی ہوئی بدبو ہے..... میں چاہتی ہوں اور صدق دل سے چاہتی ہوں کہ اپنے آپ پر یہ بات اچھی طرح واضح کر دوں کہ یہ میرا نہیں' اس کا آشوب ہے۔

اور اگر مجھے یقین ہو کہ وہ میرا یہ پیغام سننے کو زندہ اور ثابت وسالم ہوگا' تو اس کو کہلوا بھیجوں کہ بھئی یہ اچھی دھاندلی ہے کہ تم مجھے میری بے خبری میں اپنے آشوب کا امین بنا گئے' یہ لو سنبھالو اپنی امانت کہ میں اس کے باعث بہتیرے ہوشمندوں اور عافیت کے قدر دانوں سے شرمسار ہوں' اور یہ میرا فرض نہیں کہ میں تم کو خبردار کروں اور کہوں۔

''لیکن اپنے مصائب اور کلفتوں کو انگیز کرو۔

اپنی خوں رستہ جراحتوں کو بھول کر آگے بڑھو' اور بڑھے جاؤ' دیکھو پیچھے ہرگز نہ ہٹنا اور یہ صدا لگاؤ' سونے والو جاگتے رہو۔''

ہاں' یہ میرا نہیں تمہارا فرض ہے۔ اس لئے کہ میں تمہاری شاعر اور ادیب نہیں ہوں' یہ تمہارا فرض ہے کہ آج کا دن وہ ہے کہ ہر ایک اپنی صلیب خود اٹھائے گا' اور جو کسی صلیب کو کاندھا دینے کی جرات کرے گا وہ شرمسار ہوگا' چنانچہ اب مجھ پر واضح ہوا کہ یہ اس کا آشوب ہے۔

◆◆◆

ٹڈی چٹا سویٹر

ساری پرابلم تو اس ہرے سویٹر کی ہے جس کو ٹڈی نے کہیں کہیں سے چاٹ لیا ہے' مگر وہ اس کے چٹے ہوئے چھید اتنے نمایاں تو نہیں کہ دیکھنے والی نظر تاب ہی نہ لا سکے۔

پھر بھی ساری پرابلم اسی کی کھڑی کی ہوئی ہے۔ بعض دکھڑے بڑے معمولی ہوتے ہیں' لیکن سارا بکھیڑا اور سارا دکھ ان کا ہی کا ڈالا ہوتا ہے۔ اور یہ اس ہرے سویٹر کا دکھڑا کوئی کب تک روئے جس کو ٹڈی نے چاٹ کر کہیں کہیں سے چھید یلا کر دیا ہے۔

اس دن میں بالا ہی بالا باہر نکل گئی تھی' کلاس در کلاس پڑھاتی ہوئی باہر نکلی اور ہر طرف سے نظریات بجائے گیٹ کی طرف جاتے جاتے میں نے بڑے سکھ سے سوچا تھا۔

''یہ بھی غنیمت ہے کہ کلاس میں بیٹھ کر پڑھنے والے لوگ ہمارے شاگرد ہوتے ہیں اور وہ ہمارے منہ در منہ ہماری بدعنوانیاں کے بکھان کرنے نہیں بیٹھ جاتے۔ کاش! لوگ ہمیشہ یا پھر کچھ عرصے تک شاگرد ہی رہا کریں۔''

پھاٹک سے نکلتے نکلتے میرا دل بہت بھاری ہو گیا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں واقعی بہت Hurt ہوئی ہوں۔

اگرچہ سفید شال کے نیچے ہلکے رنگ او ہلکے کپڑے کی قمیص یا کرتے پر سویٹر کی موجودگی اتنا سنگین جرم تو نہیں پھر بھی بعض وقت یہ بات انسان کے اندر احساس جرم کا باعث بن جاتی ہے اور اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے دوسروں کی توہین کی ہے اور ان کو Hurt کیا ہے۔

میری آنکھوں میں بار بار شدید نمی سی امنڈ رہی تھی جس کو بدقت اور پھیلا پھیلا کر میں نے لوٹا لوٹا دیا تھا اور پھر اس کے بعد ٹڈی چٹے ہرے سویٹر کا مسئلہ درپیش تھا۔

اوہ' یہ ہرا سویٹر۔

اس لئے کہ کالا سویٹر اب کپڑوں کے درمیان موجود نہ تھا اور بعض سویٹر' میرا مطلب ہے' بعض دکھڑے بڑے معمولی ہوتے ہیں' لیکن وہ ایک بکھیڑا بن جاتے ہیں۔ خیر ابھی کل آنے والی صبح میں ایک رات کا فاصلہ باقی ہے اور ہرے سویٹر کا فیصلہ بھی اس فاصلے کے طے ہو جانے کے بعد ہی ہو سکے گا۔

سردی میرے لحاف میں دھیرے دھیرے رینگ رہی ہے اور میں لحاف کو ہر طرف سے دبانے کی کوشش میں اور بھی کھل کھل جا رہی ہوں۔ اس سال لحاف میں دبک کر گرم ہو جانے کے بعد مجھے بہت سردی لگتی ہے۔

موہوم دھماکوں اور صاف صاف سنائی دینے والی تڑتڑ کی آوازیں پھر آ رہی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے 25 پونڈ پر چل رہی ہے..... اور اب ہم کتنے ہوشیار ہو چلے ہیں۔ ہم ریڈیوں اور اخبار میں آنے والی اطلاع سے بہت پہلے خود اپنے آپ کو فوری طور پر اطلاع دینے کے اہل ہو گئے ہیں۔

اوہ میرے اللہ! ہائے رے بڑی سردی ہے' اونہہ توبہ' پھر کسی طرف خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں' پتا نہیں کدھر' برکی' ہڈریارہ' فاضلکا' واہگہ' اٹاری' بیدیاں' فخر' بھائی شفیق ابوالقاسم' کپتان' سلمان' امن چین کے دنوں میں ہر گھڑی خیالی روگوں میں مبتلا رہنے والے کیپٹن ریاض اور ڈھیروں جانے ان جانے اور پرائے آدمی۔

تڑ۔ تڑ۔ سی ہائے اللہ! یہ لحاف ہر طرف سے دبا ہونے کے باوجود ہوا کیوں دے رہا ہے۔

یہ سیلی سیلی کامنی اور پھر پھراتی ہوا میرے ہی لحاف کے اندر کیوں گھسی چلی آتی ہے۔

ایک اور دھماکا۔

ہائے! وہ پلاسٹک کے ہوئے تو نہیں' اے میرے مولا بھن کر رہ جائیں گے' تڑتڑ..... اف! یہ خلاف ورزیاں' ارے کہیں گھر والی نہ مر جائے۔

ہائے میری گھر والی!

کوئی نہیں مرتی آپ کی گھر والی' وہ تو پچھلے مورچوں میں ہے۔ خلاف ورزیاں تو اگلے مورچوں میں ہو رہی ہیں۔

اپنے بستر پر سے منو نے مجھے ٹوکا ہے۔

اور اگلے مورچوں میں بھی تو کوئی ضرور ہے' میں سوچتی ہوں' لحاف میں سردی پھر کنکھجورے کی طرح رینگی ہے۔

اور اب اندھیرے میں مجھے کماد کے کھیت صاف صاف نظر آ رہے ہیں' مرجھائی ہوئی تازگی پر چھائی سفیدی لئے ٹھٹھری ٹھٹھری جا بجا سے چھدرائی ہوئی کماد کی فصل کتنی گہری سوچ میں ہے اور میں نے کئی فصل کو کبھی یوں اداس اور سوچ میں نہ دیکھا تھا اور اس طرف صاف کئے ہوئے قطعے میں دو چھوٹے اور خشک درختوں کی مضبوط ڈالوں پر جمے ہوئے تختے کی میز سلیقے سے رکھے ہوئے ٹین اور تام چینی کے برتنوں کے درمیان کہیں کہیں میں انہماک سے چائے انڈیلتی ہوئی ''گھر والی'' کے چہرے پر بہت سے بچوں کے

دریان گھری اور کھانا تقسیم کرتی ہوئی ماں کی سی آسودگی اور سکون ہے۔

اور اتنے گھریلو اور پرسکون منظر میں کوئی کہاں تک Behave کر سکتا ہے چنانچہ میں کچلی اور ڈھئی ہوئی کماد کی ایک پھاندی پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی ہوں۔

میں نے چائے کی پیالی گھر والی کو واپس دے دی ہے' میں تو ''مگ'' میں پیوں گی۔ تم اپنی پیالی اپنے پاس رکھو۔ گھر والی ہنس دی ہے' اس کے شفاف اور روشن دانت گلابی ہونٹوں کے پہرے کے باوجود باہر نکل پڑے ہیں' اس کی اجلی پیشانی پر ستارے سے دمک رہے ہیں اس نے پیالی واپس لے کر میرے ہاتھ میں مگ پکڑا دیا ہے۔

سو۔ ہائے کتنی گرم اور نفیس چائے ہے۔

اچھا' بھائی گھر والی' ایک بات تو بتاؤ۔ میں نے مگ رکھ دیا ہے۔

گھر والی پھر ہنسی ہے۔

کیا بات؟

اپنا رنام کی۔

امارنام نورالصباح۔

''نورالصباح'' ارے بھئی سنتا کوئی' گھر والی کا نام بھی تو لڑکیوں والا ہے۔ مگر کسی نے بھی نہیں سنا ہے' وہ اپنی تصویر کھنچوانے میں مصروف ہیں اور طرح طرح کے پوز بنا رہے ہیں۔

اور نورالصباح اس وقت بہت ایٹ ہوم ہے' اس نے اپنی خالی قمیص پتلون سے باہر کر رکھی ہے اور پتلون کی ساری کریز مٹ گئی ہے۔ وہ مٹکے میں سے پانی نکال نکال کر کسی کا ہاتھ دھلا رہا ہے' بات یہ ہے کہ نورالصباح Other rank کا آدمی ہے ارکمشنڈ افسروں کی اصطلاح میں محض جوان کہتے ہیں۔ اس لڑائی میں اپنا جوان خوب ڈٹ کر لڑا ہے۔

مگر یہ نورالصباح تو بہت ینگ اور ہینڈسم ہے۔

اور وہ کہتا ہے:

اماباڑی نوا کھالی کے۔

لیکن میں نے فوراً ٹوکا ہے' تم جھوٹ کہتے ہو' تم تو پنجاب کے رہنے والے ہو۔ اور کوئی نہیں تم کھیم کرن ویم کرن پر لڑے ہو۔ تم

تو بس گھر والی ہو بڑے انہماک اور اہتمام سے اتنی مزے دار چائے پلانے والی گھر والی۔

اور گھر والی حسب سابق اپنے شفاف دانت نکال کر خوب ہنس رہی ہے۔ نور الصباح چھالیا کھاؤ گے؟ میں زیادہ دیر چھالیاں کے بغیر کب رہ سکتی ہوں۔ اور نور الصباح کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔

ارے آپ شاید بنگال گئے ہو جو آپ کو پتا ہے کہ.....

ہم بنال گئے یا نہیں، تمہارے لئے چھالیا آئے۔

نور اطک انی بونگلاما تو، نور الصباح اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے۔

آہو بہت لوگ کہتے ہیں کہ امی بونگلاما تو۔

گھر والی اور اس کا ساتھی خوب ہنس رہے ہیں، یہ کون سی بولی ہے؟

اب یہ ایسی ہی بولی ہوا کرے گی، اچھا تم لوگ ایک بات بتاؤ۔

جی پوچھو۔

تم نے کتنے گنے چوسے؟ میرا اپنا دل ایک چوسنے کو مچل رہا ہے۔

نور الصباح کی آنکھوں میں لال ڈورے ابھر آئے ہیں، اس کے روشن روشن چہرے پر بدلی سی چھا گئی ہے۔

اس نے اپنا گلا صاف کیا ہے۔

ہم یہ گنا کیسے دل سے چوسے گا؟ گوریب لوگ اپنی فصل بھی نہیں اٹھا پایا ہم نے سارا کھیت برباد کیا ہے۔

نور الصباح یہ زمین ہماری ہے یا ان کی؟

نور الصباح کی آواز ایک دم صاف ہو گئی ہے۔

اپنی۔ اس نے بڑے پیار سے زمین کی طرف دیکھا ہے، ان کی زمین کھیم کرن سیکٹر میں ہے۔ یہ ہماری اپنی زمین ہے۔ یہ امارا چاشی لوگ کی فصل ہے، انہوں نے اپنی فصل کے اندر اپنے ہاتھوں سے ہمارے ساتھ ساتھ مورچے کھودے ہیں۔ ہمارا دل بہت خراب ہوتا تھا، مگر ان کا دل بہت بڑا ہے۔

گھر والی اور اس کے ساتھی نے میری دی ہوئی چھالیہ منہ میں ڈال لی ہے اور اچانک ہی ان کی آواز میں بڑا گھریلو پن آ گیا ہے۔

باجی یہاں ہر چیز اللہ کے فوجل سے ملتا ہے' مگر چھالیاں کبھی نہیں ملی۔ نورالحق کہہ رہا ہے:

کتنے دن بعد کھائی ہے؟

بہت دن بعد۔ معلوم پڑتا ہے ہم اپنے گھور میں بیٹھا ہے۔

اور اب میں سوچ رہی ہوں کہ محاذ پر بیٹھے جوانوں کو چھالیا دینا ان کے ح آ میں بہتر ہوگا یا برا' نہیں معلوم چھالیا کا Strategic پہلو کیسا اور کیا ہوسکتا ہے۔

رات دھیرے دھیرے بیت رہی ہے۔ سردی بدستور میرے لحاف کے اندر کلبلا رہی ہے اور اس سب کا مطلب یہی ہوا نا کہ آنے والی صبح کے اور میرے درمیان رات کا فو فاصلہ تھا وہ بھی طے ہوجا رہا ہے اور ہرے چھیدیلے سویٹر کا فیصلہ ابھی وہیں ہے جہاں پہلے تھا۔ بعض باتوں کے فیصلے کتنے مشکل اور تباہ کن معلوم ہوتے ہیں۔

مگر وہ فیصلے کرنے ہی پڑتے ہیں۔

رات کا ایک پل اور بیت گیا۔

تڑتڑ..... دھماکے..... اوہ! سردی' خلاف ورزیاں' منو کہہ رہی ہے پتا نہیں برکی..... فاصلہ' بیدیاں..... ہم تم مینڈھر اور سیالکوٹ کی بات فی الحال بالکل نہیں کر رہے' گواہ رہنا۔ میں نے لحاف کو ہر طرف سے دبانے کی کوشش میں اپنے آپ کو اور بھی کھول لیا ہے۔

ہاں مینڈھر میں تو برف۔

سی! ہائے کتنی سردی ہے اور اگر مینڈھر کی برفوں کی بات ہوئی' تو پھر لحاف کے اندر کا کیا حال ہوگا۔ یقیناً بات بدلنا پڑے گی۔

سنو آج آسمان پر بادل بھی تو ہیں۔

بادل! بادل کا مطلب ہے کہ پانی برسے گا' منو نے کروٹ لینے کا ارادہ منسوخ کر دیا ہے اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی ہے۔

ایک بات تو بتایئے یہ محاذ ایمونیشن (Amunation) کھلا پڑا ہوگا۔

پھر تم نے انگریزی بولی۔

انگریزی! میں نے انگریزی کب بولی؟ وہ حیرت سے پوچھتی ہے' میں تو ایمونیشن کی بات کر رہی ہوں۔

ہاں اور سارے Other rank اور کمشنڈ آفیسر بھی۔

پھر آپ نے انگریزی بولی۔ ہم دونوں ہنس پڑتے ہیں۔

سیالکوٹ میں بھی پانی برسے گا' کیا اس وقت وہاں بھی Violations ہو رہی ہوں گی۔

منو کے سارے سوال خبطوں سے کیوں ہوتے ہیں۔

میں سوچ رہی ہوں۔

کیوں' سیالکوٹ کی فکر کیوں پڑ گئی؟

احسن ماموں کی وجہ سے۔

لعنت' احسن ماموں پر۔

لعنت' احسن ماموں پر۔

کیوں واہ' ہی از سو سویٹ اینڈ سو ہینڈسم۔

اے ہٹو بھی۔

تو کیا آپ کو نہیں لگتے۔

خیر اتنے بھی نہیں ہیں۔ آج کل لگنے لگے ہوں گے۔

اچھا بھئی نہ ہوں گے ہمیں تو وہ ہمیشہ سے اچھے لگتے ہیں۔

منو کی آواز مر گئی ہے۔

ایک بات بتاؤں؟

کیا؟

معلوم ہے مجھے بندوق چلانا کس نے سکھائی ہے۔

کس نے؟

احسن نے' اور ہم دیوار کا گھوڑا بنا کر بیٹھ جایا کرتے تھے اور ائیر گن چلانے کی مشق کیا کرتے۔ پہلے پہلے گل زری سے مشق کرتے تھے۔

گل زری کیا؟

بھئی ایک کیل سی ہوتی ہے نوک دار اس کے پیچھے لال سبز سن کا ایک پھندنا سا لگا ہوتا ہے۔

احسن کا کہنا تھا اس سے بلی مر جائے گی' مگر مجھے ایسا لگتا تھا کہ بلی کی کھال اور گوشت کے بجائے وہ میری اپنی کھال میں گھسی جا رہی ہے۔ کبھی ہاتھ ہی نہ اٹھا بلی پر۔

پھر آپ نے خاک چلانا سیکھی ہوگی۔

ارے واہ! تیسرے دن جو ہم نے چھرا رکھ کر ایک چیل کا نشانہ کیا' تو وہ کم بخت سچ مچ مر گئی اور میں اتنی زروس ہوئی کہ کیا بتاؤں۔ جناب میرا نشانہ بڑا صحیح.....

اب شروع کر دی شو آف۔ منو نے بات کاٹ دی۔

اچھا جانے دو' چلو اب سوتے ہیں۔

دھماکوں کی دبی دبی آواز پھر آتی ہے۔

اچھا سونے سے پہلے ذرا آیت الکرسی تو پڑھ ڈالئے۔

ارے بیٹا! اب چھوڑو آیت الکرسی کو۔

کیوں چھوڑ دیں؟

تم بتاؤ کس کس کو آیت الکرسی کے ورد میں دو گی۔

خورشید بھیا ایک..... منو اب انگلیوں پر نام گنانے کے موڈ میں ہے۔

ہٹاؤ' اللہ کے حوالے کر دو' محاذ پر صرف اتنے ہی لوگ نہیں جن کے لئے تمہاری انگلیاں کافی ہوں گی۔

تو آیئے پھر سب کو ورد میں دیے دیتے ہیں۔ جب سے جنگ ہوئی ہے۔ منو بہت مستعد ہوتی جا رہی ہے۔

کیا کرو گی دے کر چھوڑو۔ میری آواز میں خفگی ہے۔

کیوں؟

بھئی ہٹاؤ' اور اب میں Irritate ہو رہی ہوں اس لئے بھئی کہ مجھے اس وقت ایری ٹیٹ Irritate کا اردو بدل..... یاد نہیں آ رہا۔

ایک دو چار چھ دس منٹ۔

خالہ!

ہوں!

کدھر چل دیں۔ پھر روانہ ہو گئیں۔

نہیں تو!

نہیں تو کیسے قطعی چل دی ہیں۔ اچھا سچ سچ بتایئے' اس وقت کہاں ہیں۔

''ہیکو شیلے'' میں۔

ہیکو شیلے میں جھوٹ!

منو! میری آواز میں رعب ہے۔

جی!

سو جاؤ اب۔

اور اب اس وقت واقعی ہیکو شیلے میں ہوں اور بے حد نروس ہو رہی ہوں۔

جب آپ کو اپنی آرزو کے مطابق اس چھوٹی کھڑکی کے قریب بیٹھنے کو نہ ملے جس کے قریب بیٹھ کر ایک چکی کافی کی لے کر مال روڈ کی کالی اور انسانوں سے بسی سجی سڑک پر نظر ڈال کر بھی آپ کو یہی محسوس ہوتا ہو کہ آپ اسنو وہائٹ میں اور دنیا بھر کے خطروں اور مخالفتوں سے پناہ لینے کے لئے جنگل کے خاموش ترین گوشے میں کھڑے بونوں کے اس ننھے منے گھروندے میں محفوظ ہیں' تو پھر آپ کے دام ہی پھک گئے نا' جب کہ کافی ایک پیالی انسان سڑک پر بھی کڑا ہو کر پی سکتا ہے۔

اور پھر جب اس کھڑکی کے قریب والی جگہ سے آپ کو محروم کرنے والے گروپ اس قسم کی باتیں کر رہا ہو کہ جن کو سن کر آپ کو یوں محسوس ہو کہ دیوار کا دیوار کا گھوڑا بنا کر بیٹھے بیٹھے مذاق ہی مذاق میں جس چیل کا نشانہ لیا تھا وہ گھائل ہو کر پھڑ پھڑاتی ہوئی آپ کے قدموں میں آ گری ہے' تو پھر آپ نروس نہ ہوں تو کیا ہوں۔

اس گروپ کی باتیں مجھے واقعی نروس کئے دے رہی ہیں۔ ارے بھئی سیکنڈ راؤنڈ کی کیا خبر ہے۔

سیکنڈ راؤنڈ..... سیکنڈ راؤنڈ اب نہیں ہوتا ہاتھ منہ دھو رکھئے۔ اب آپ ڈر گئے۔ گھٹنوں کے بل آ گرے' وہ اپنی عینک بار بار درست کر رہا ہے۔

اب کچھ نہیں رکھا ہے سوائے صلح صفائی کی باتوں کے۔

پتلے سے چہرے اور عجیب طرح کی مسکراتی آنکھوں والا شخص اب وہ پائپ نکال لیتا ہے جو مستقبلاً اس کے ہونٹوں کے داہنے گوشوں میں دبا ہوا تھا۔ اس نے اپنی کہنیاں میز پر ٹیک دی ہیں۔

صلح صفائی کی بات کرنا اتنی معیوب بات تو نہیں' کامریڈ۔

اور اس نے اپنا پائپ پھر ٹھیک اس گوشہ لب کے درمیان جما لیا ہے۔

جی ہاں' ایسے وقت میں جب ساری قوم جاگ اٹھی ہے' زبردست قربانیاں دے رہی ہے' وہ لڑے کے موڈ میں ہے قوم کے بچے بچے حد یہ کہ خواتین تک نے اپنے اپنے مورچے سنبھال.....

تم تقریر اب اچھی کر لیتے ہو میری جان' پائپ والے نے بھڑکے ہوئے ساتھی کی پیٹھ پر اپنی لمبے اور صحت مند ناخنوں والی مخروطی انگلیوں والا ہاتھ رکھ دیا ہے۔

تو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں' انڈا اسے چہرے اور چناسی ناک والا مقرر اور بھی زیادہ بھڑک اٹھا ہے۔

بالکل درست' پائپ اپنی جگہ ٹھیک ٹھیک جما ہوا ہے۔

ساری قوم جاگ رہی ہے حد یہ کہ عورتوں تک نے اپنے اپنے مورچے سنبھال لئے۔ اب مجھے مورچوں کے نام سے نفرت ہو گئی ہے' نہ جانے ہم لوگ لفظوں کو پامال کرنے کے درپے کیوں رہتے ہیں۔

ہم سب مورچوں ہی میں تو ہیں۔ ایک مورچہ کینٹین بھی تو ہے' جہاں کھڑے ہو کر میں گرم گرم کباب اور ایک ایک آنے والی پکڑوں کی پلیٹ کھاتے کھاتے کینٹین والی سست اور بدمزاج سروس پر اعتراضات کرتی ہوں اور ہم لوگ ایک دوسرے سے اپنی نفرتوں اور خاشوں کا بدلہ ان کے کوٹوں کے رنگوں' بغیر فال لگی ساریوں' ہیئر اسٹائلوں اور گزشتہ سال کے خریدے جوتوں کے مزید استعمال جیسی معیوب حرکتوں پر اعتراضوں اور ریمارکس سے نکالتے ہیں اور دوسروں کو اپنی قباحتوں پر شرمندہ اسر شپٹاتے دیکھ کر ہمیں اپنے ذاتی مورچے کتنے مستحکم نظر آتے ہیں۔

واہ صاحب یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ہم ہوائی حملے کے سائرنوں کے زبان سے آگاہ ہو چلے تھے جب توپوں کی دھس دھس لوری کی لے میں تبدیل ہونے لگی' تو فائر بندی کرا دی گئی۔

خوب..... تو صاحب آپ لڑے کیوں تھے؟

اب ساری گردن ولاے صاحب کی باری تھی۔

اب تو ہم نے اپنی خندقیں قاعدے کی کروائی تھیں۔ دس دس روپے دے کر ان کو ٹھیک کروایا اور ایک دن ان میں بیٹھنا نصیب نہ ہوا' مٹی میں مل گئے وہ دس روپے' میں تو ایک آدھ دن میں پٹوا دوں گا سالی کو' عینک والے کی آنکھوں میں سخت احتجاج ہے۔

اب مجھے نہ جانے کیوں فخر کا خیال آ گیا ہے کہ فخر الاسلام کا یہ شیوہ ہے کہ جب بات انتہائی سنجیدہ موڑ پر پہنچے گی اور پاس بیٹھنے والوں میں کسی کی آنکھوں پر عینک موجود ہے تو وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھ سے ایک خاص زاویے پر ٹھہرا لے گا۔ ذرا ٹھہریے گا بس یوں' وہ دیکھئے ذرا مجھے یہ درست کرنا ہے اور آپ کی عینک کے شیشوں کے مقابل ہو کر بڑی سنجیدگی سے اپنی نئی نوکی مونچھیں سنوارنے لگے گا جو اس کو حکماً رکھوائی گئی ہیں پھر سیدھا ہو کر نہایت خوش اخلاقی سے شکریہ ادا کرنے کے بعد پوچھے:

ہاں تو آپ کیا فرما رہے تھے؟

اور وہ کہہ رہا تھا کہ میرا بن کر اتنا ٹھنڈا ہے' اتنا نم ہے کہ اگر ڈیڑھ فٹ ارکھد والوں' تو پانی نکل آئے اور ہم آگ اس لئے نہیں جلا سکتے دشمن کے اور ہمارے درمیان نگاہ کا فاصلہ ہے۔

اور اس سے پوچھئے کہ بھی اب کیا کر رہے ہو تم اور کیا ارادے ہیں۔

ارادے قطعی نیک ہیں' پھر وہ نہایت صاف گوئی سے عرض کرے گا کہ اگر آپ گپیں سننے اور ان پر ایمان لانے کو تیار ہیں' تو یہ بندہ حاضر ہے ورنہ بات دراصل یہ ہے کہ میں ایسی کوئی بات بتانے کے ڈوڈ میں نہیں جس کا تعلق حقیقت سے ہو۔

اب کہئے کیا حکم ہے؟ وہ سنئے پر دونوں ہاتھ رکھ کر آپ کے روبرو جھک جائے گا۔

یہ وقت ان سب باتوں کے سوچنے کا نہیں۔ منو سو گئی ہے اور پانی چھم چھم برس رہا ہے۔

یا اللہ یہ پانی تھم جائے! نہیں معلوم اب میری عادتیں کیوں بدلتی جا رہی ہیں' مجھے تو اندھیاری رین کے برستے پانی کی چھما چھم میں بڑی پیاری نیند آتی تھی۔

دھندلائی ہوئی کہر آلود صبح میں ٹڈی چٹے ہرے سویٹر کے متعلق اور فیصلہ کیا بھی کیا جا سکتا ہے بجز اس کے کہ انسان اس کو پہن کر کھڑا ہو جائے۔

اور اب جا کر معلوم ہوا کہ آج کی صبح اور اس سے قبل فیصلے کا وہ سارا وقفہ اس آنے والے سائیکلون کے آثار تھے۔ آوازوں کے خوف سے میں نے اپنے کان بند کئے مگر وہ کھل کھل گئے۔ میری ٹانگیں لرز رہی ہیں اور اب پتا چلا کہ طوفان ہوئی حملے سے زیادہ ہیبت

ناک چیز ہے۔

اے ایمان والوں! اپنے کان اور آنکھیں مضبوطی سے بند کرلو تا کہ تمہیں استقامت حاصل ہو۔

مگر طوفان آتا ہے' تو وہ دب بھی جاتا ہے جب تیز و تند آوازیں دب جاتی ہیں' تو نرم آوازیں بھی سنائی دینے لگتی ہیں۔

مائی ڈیئر گرل اس سویٹر کا رنگ بہت پیارا ہے' مگر اس کو ٹنڈی نے چاٹ لیا ہے' کہیں کہیں سے۔ یہ آواز نرم تھی۔

اور ایسی آوازوں کے متعلق سوچا بھی جا سکتا ہے' اور ان کا جواب بھی دیا جا سکتا ہے۔

ہاں جس دن گرم کپڑے دھوپ میں ڈالنے کو نکالے' وہ چھ ستمبر کی صبح تھی' سارے واپس بکس میں ڈال دیئے اور یہ اوپر الماری ہی میں پڑا رہ گیا۔ اور اس کی یاد عین اس وقت آتی تھی جب ہوائی حملے کا الارم ہوتا تھا' مگر پھر بھی اتنا تو نہیں بگڑا ہے۔

ہاں رفو بھی ہو سکتا ہے' مگر اب تم اس کو بدل ہی ڈالو۔

بدل ڈالوں! میں اداسی سے ہنس پڑی ہوں۔

کیوں' تم ہنس کیوں رہی ہو؟

میں ہنس کیوں رہی ہوں' اس کے جواب میں ان سے کیا کہہ سکتی ہوں' کیا یہ کہنے بیٹھ جاؤں کہ یہ ٹنڈی چٹا سویٹر بدڈالنے کا مشورہ تو ہر کوئی دے سکتا ہے' اس لئے کہ ایسی چیز ذوق جمال کو Hurt کرتی ہے۔ بے شک یہ ہماری اور آپ کی توہین ہے کہ لوگ ہمارے سامنے ٹنڈی چٹے اور کہیں کہیں سے چھیدیلے سویٹر پہن پہن کر بیٹھ جائیں جب کہ اس کو بدلا بھی جا سکتا ہے۔

لیکن مسرور میاں کے چہرے کا کیا بنے گا۔ اور اس میں شک نہیں کہ ایسا جا بجا سے کٹا پھٹا چہرہ بھی ہمارے آپ کے ذوق جمال کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی توہین ہے کہ لوگ ہمارے آپ کے سامنے ایسا چہرہ لے کر بیٹھ جائیں اور قصہ یہ ہے کہ مسرور میاں کا چہرہ بدلا بھی نہیں جا سکتا ہے اور رفو گر بھی بے چارہ کیا کرے گا جب کہ جبڑا ہی اڑ گیا ہو' ابان چار ٹکڑے ہو گئی ہو اور تالو پھٹ گیا ہو۔

چہرے نقابیں نہیں ہوا کرتے جو ہر سٹے بدل لی جائیں۔ آپ نے مجھے ٹنڈی چٹا سویٹر بدلنے کا مشورہ یوں دیا ہے کہ آپ نے اس سویٹر کو چھیدیلا ہونے سے پہلے دیکھ رکھا ہے' لیکن میں نے بھی تو مسرور میاں کے چہرے کو پہلے سے دیکھ رکھا ہے۔

ان دنوں سیالکوٹ میں ان کا چہرہ شفاف اور مسکراتا ہوا کرتا تھا۔ ایسی آنکھوں سمیت جن میں پی کی بھی تندی اور درشتی نہ آتی تھی' بلکہ وہ اور بھی زیادہ ہنسنے لگتی تھیں اور ان دنوں سیالکوٹ کی فقط یہی اہمیت تھی کہ وہ اقبال کا شہر تھا اور وہاں ہم سب شادی کے گھر میں جمع

تھے۔

آتش دانوں میں موٹے موٹے لکڑوں کی آگ روشن تھی۔ بڑی اور لمبی میز پر یہاں سے وہاں تک کھانے چنے تھے۔ چوکولیٹ رنگ کے سویلین سوٹ میں مسرور میاں کا چہرہ ہنس رہا تھا اور انہوں نے اپنی پلیٹ میں مرغی اور بریانی بار بار ڈالی تھی۔

یہ ان دنوں کی بات تھی جب سیالکوٹ فقط اقبال کا شہر تھا۔

اور اب مسرور میاں مرغی کی لئی سی تیار کرواتے ہیں اور تقریباً بھرتاک ہوئی بریانی بمشکل نگلتے ہیں۔ سنا ہے کہ ایک اور بار پلاسٹک سرجری ہو جانے کے بعد ان کا چہرہ ساٹھ برس کے بوڑھے سے کچھ کم عمر کا معلوم ہونے لگے گا اور وہ اس سلسلے میں بہت پر امید ہیں' ان کی آنکھوں میں ایک اجنبی سی چمک ہے' وہ کہتے ہیں کہ ابھی مجھے اپنا انتقام لینا ہے اور یہ کہ آنکھوں کی یہ چمک میرا آدرش ہے۔

لیکن میرا ٹڈی چنا چھید یلا سویٹر کیا کہتا ہے' وہ مسرور میاں کا چہرہ تو نہیں کہ جس کو بدلا ہی نہ جا سکے' اور یہ کماد کی وہ فصل بھی نہیں جو جا بجا سے اس لئے چھدرا گئی ہے کہ وہاں گھر والی اور اس کے ساتھیوں کے بنکر ہیں۔

یہ کپاس کے وہ کھیت تو نہیں جن کی فصلیں اس ٹڈی چنے سویٹر سے کہیں زیادہ معلوم ہوتی ہیں۔

میں نے سیاہ سیاہ سی ڈنڈی اور پتیوں پر جما ہوا کپاس کا سہما سہما سادہ پھول توڑ کر اپنے سر میں لگا لیا ہے۔

کبھی کسی نے کپا بھی اپنے سر سجائی ہے؟ کوئی پیچھے سے ہنسا ہے۔

میں پھر سوچ رہی ہوں۔ یہ سویٹر مرچوں کا وہ کھیت تو نہیں جس کی فصل پانی نہ ملنے کی وجہ سے کہیں کہیں سے سوکھ کر چھدرا گئی ہے اور ننھی ننھی مرچیں سن بلوغ کو پہنچنے سے پہلے پک کر سرخ ہو گئی ہیں۔

ٹھٹھری ٹھٹھری وقت سے پہلے ہی سرخ ہو جانے والی چھوٹی چھوٹی مرچیں کتنی لگ رہی ہیں۔

پتا نہیں یہ مرچیلی اور کھٹی چیزوں کی صورت اور نام ہی سے منہ میں پانی کے سوتے سے کیوں پھوٹنے لگتے ہیں۔

یہ مرچیں کس کی ہیں؟ میں نے نہ معلوم کس سے پوچھا ہے۔

لوگی؟ پگڑی باندھے اور لاٹھی سے اپنی بھیڑوں کو ہانکنے والا چھوٹا چرواہا جھک کر مرچیں توڑنے لگتا ہے۔ یہ ہیں کس کی؟

''اب کسی کی نہیں۔''

میں دوں گا' میں دوں گا' کتنی ہی آوازوں نے ایک ہی چھوٹا سا فقرہ یوں دہرایا ہے جیسے یہ بھی کوئی نعرہ ہو' سرخ مرچوں والے

مرجھائے ہوئے سبز پودوں کے چھدرے فاصلوں کے درمیان یہاں سے وہاں تک خاکی وردیاں جھکی ہوئی تیزی سے مرچیں توڑ رہی ہیں' پتلی لمبی ہری' گٹھیلی سبز اور ننھی منی اور سجل مرچیں۔ دبا دب میری جھولی میں گر رہی ہیں۔ کہتے ہیں یہ وہی ہاتھ ہیں جنہوں نے دشمن کو پسپا کر دیا تھا۔

اب میرا دل مرچوں سے بھر چکا ہے' مگر میں ان کو منع نہیں کر پا رہی ہوں' اس لئے کہ مرچ بے حد گھریلو چیز ہے۔

چھوٹا لڑکا ایک طرف کھڑا ہے اور بڑے بڑے بچے بڑے مان سے کہہ رہے ہیں۔

''باجی اس کو مچھی چاول سے کھانا۔''

''باجی اس کو پالک گوشت سے کھانا۔''

''باجی اس کو آلو قیمے کے ساتھ کھانا۔''

ہر ایک کی پسند مجھ پر ٹھونس دی گئی' تو اللہ میرے! یہ مرچیں تو بے شمار ہیں اور اب میں ایک بار پھر یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی ہوں کہ محاذ پر پڑے جوانوں کے سامنے مرچوں کی Strategy کیا ہو سکتی ہے۔ اب ہم سوار ہو چکے ہیں۔ میر یکھڑ کی کے پاس ارشد' نور الصباح اور اس کا ساتھی اور پانی والا کھڑے ہیں۔

اور نہیں معلوم کہ اب وہ پہلے کی طرح ہنس کیوں نہیں رہے۔ گھر والی کی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے نظر آ رہے ہیں۔

اچھا بھئی گھر والی اور نیک دھن باد تمہاری مزے دار چائے۔ اور اور..... میں یہ کس زبان سے کہہ سکتی ہوں کہ اس بات کا شکریہ کہ تم نے ہمیں اپنی اپنی جگہ ہنستا اور آباد رکھا۔ اور اب ہمیاں سے جا کر اپنے نرم اور گرم بستروں میں سو سکیں گے..... اس لئے بس میں ہنس پڑتی ہوں۔

''اب آپ کب آؤ گے؟''

''جب اللہ لائے گا۔''

''ہم کیمپ کمانڈر صاحب کو بولے گا' ان کا پاس الگ بنوا دیں۔''

میں نے بھاری سے جسم والے کمانڈر کی طرف دیکھا ہے جنہوں نے ابھی تھوڑی دیر ہوئی مجھ سے فرمائش کی تھی۔

''اپنی ہمارے شونگھے ایک فوٹو اٹھواؤ ہم اپنی بون کو پاٹھائیں گے کہ ایکھائے اوہ امارا ایک جون بوں آچھے۔''

نہیں معلوم اس نئے لسانی حادثے کو کیا نام دیا جائے گا اور اس کو کس انداز سے پڑھایا جائے گا' جو کمادکی اس چھدرائی فصل کے

درمیان زبانوں پر سے گزرا ہے۔ میں نے تشویش سے سوچا تھا پر کہا یہ تھا۔

مگر میں تو گھر والی' پانی والے اور ان سبھوں کو ساتھ کھڑا کروں گی۔ اہو! اہو! میں ان سب کو بھی بلائے لیتا ہوں۔

اور یوں ہم سب نے مل کر ایک چھوبی اٹھوائی۔

گاڑی اب چل پڑی ہے' مورچوں کر شام کے دھندلے اتر رہے ہیں۔ اس طرف کماد کپاس اور مرچ کی فصل ہے جو چھیدیلی ہو کر ماری گئی ہے۔ اور اس طرف شہیدوں کے مزار ہیں۔

تم نے ایک فصل اجاڑ دی ہے اور ہم نے ایک دوسری فصل بو دی ہے۔ میں نے اگلے مورچوں کی اور جانے والے راستے کی سمت نظر اٹھائی ہے جن سے آگے دشمن کے مورچے ہیں۔ دانے بو دیئے گئے ہیں اور ابھی ابھی انہیں ہم نے اپنے آنسوؤں سے سینچا ہے۔

خورشید صاحب شہیدوں کو امانت رکھنے اور پھر اکھاڑ کر لے جانے کے مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں اجسم کو اس مٹی میں رہنے دو جس مٹی میں وہ اپنی خوشی سے ملا ہے۔

خورشید صاحب سچ کہتے ہیں' دانہ ایک بار بو کر اس وقت تک اٹھایا ہی نہیں جا سکتا جب تک کہ وہ فصل نہ بن جائے' گاڑی تیز ہو گئی۔ اب انکے اور ہمارے درمیان غبار کا پردہ تن گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اب مجھے کچھ نظر نہیں آتا بجز اس کے کہ اسٹاف روم والے صحن میں کرسیاں دھوپ میں پڑی ہیں اور ہم سب ان پر بیٹھ کر دنیا زمانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے اونوں' سویٹروں' رشتوں اور باہر سے آئے ہوئے کوٹوں ٹیٹ ریکارڈوں' کیمروں اور شوہروں کی باتیں کر رہے ہیں۔

اور ان سب پر مستزاد کینٹین میں سے اٹھتی ہوئی اشتہا انگیز خوشبوئیں اور برتنوں کے چھنا کے۔

زندگی کا خرام ایک بار پھر سے نرم رو ہو گیا ہے۔ اور اب آدرش کی وہ سختی جو مسرور میاں کی آنکھوں میں انتقام بن کر چمکتی ہے' پھر سے پگھل رہی ہے۔ اب میں اپنی اس کھڑکی کے باہر بڑی افسردگی سے دیکھ رہی ہوں' ایک عجیب سے مضحکہ خیز احساس کے ساتھ کہ جیسے کوئی چیز کھوئی سی جا رہی ہو۔ زن زن..... آسمان کی سمت سے ایک تیز دھر دھراہٹ کی آواز دلی آ رہی ہے اور الیکشن اتھارٹی کے دفتر کے پاس کھڑے دھوبیوں اور دکان داروں کے بچے عقلی گدے لڑا رہے ہیں۔

سپر ہے 104 ہے' مگ ہے مگ۔

گھروں میں گھر والیاں اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں' ''تینوں رب دیاں رکھاں۔''

فقط ایک ملکہ ترنم اس اڑے والے کی فکر میں گھلی جا رہی ہے۔ میرے اندر نقصان کا احساس بڑھ رہا ہے۔

کہیں میرے اندر کی کوئی چیز ٹوٹ نہ جائے۔

ویسے چیزیں تو ٹوٹا پھوٹا ہی کرتی ہیں' ہڈیارے کی مسجد کا مینارہ مسرور میاں کا چہرہ اور کماد' کپاس اور مرچوں کی فصلیں' مگر بعض چیزیں ٹوٹ آدرش بن جایا کرتی ہیں اور وہ ان کو سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں' مسرور میاں کا آدرش ان کا چہرہ ہے' نور الصباح یعنی گھر والی اور اس کے ساتھیوں کا آدرش چھدرائی ہوئی کھیتی ہے' اور..... اور میرا آدرش..... میرا آدرش.....

ٹھہرو' وہ مجھے مل گیا' میں اسے سنبھال کر رکھوں گی..... اور یہی میرا آخری فیصلہ ہے۔

یہ ٹڈی چٹا سویٹر چھ ستمبر کی یاد دلاتا رہے گا جس کی وجہ سے میں اس کو واپس بکس میں نہ ڈال سکی تھی۔

◆◆◆

سہارا

رن کچھ میں ہونے والے معرکے کے خبر شہر میں پھیلی تو یہ افواہ بھی گرم ہوئی کہ جتنے بھی سابق فوجی ہیں ان کو دوبارہ واپس طلب کر لیا جائے گا اور اسی افواہ نے اس کو ہول جول میں ڈال دیا تھا اور خبر تو خیر اس تک اخبار کے ذریعے پہنچی تھی' مگر یہ افواہ دوسری تمام افواہوں کی طرح جمعدارنی کے ذریعے پہنچی تھی جو کبھی اس کے دیئے ہوئے ٹھیک ٹائم پر نہ آئی جو اس نے اس کو کام پر لگاتے ہوئے دیا تھا۔ وہ ہمیشہ دن چڑھے یعنی گیارہ ساڑھے گیاہ بجے مٹکتی ہوئی اس کے کمرے میں داخل ہوتی اور بلا کچھ کہے سنے الماری کے نیچے سے برش نکال کر فرش صاف کرنے پر ٹوٹ پڑتی' تو پھر مجبوراً اس کو ہزارویں مرتبہ جمعدارنی کو وہ بات سنانا پڑتی کہ جب اس کی ممی زندہ تھیں تو کس طرح ٹھیک اور ایک وقت مقررہ پر جمعدارنی آ کر کمرے اور غسل خانے آئینے کی موافق چمکایا کرتی تھی۔ اور کبھی کبھار جب اس کے آنے کا وقت ساڑھے گیارہ سے بھی اوپر ہو جاتا تو پھر باحتیاط انگلیوں پر گن کر حساب لگا کر یہ اطمینان کر لینے کے بعد کے مہینے کے پندرہ دن ادھر گزر لئے ہیں اور اگلے پندرہ باقی ہیں۔ وہ بڑی رعب دار اور روکھی آواز میں جمعدارنی کو نوٹس دے دیا کرتی تھی۔

اچھا ٹھیک ہے فیر ہم دوسرا جمعدارنی کا انتظام کرلے گا۔ وہ بولتا یہ دن تم ہور نکال دو فیر ہم پہلی تاریکھ کو تمہارا حساب کر دے گا' ٹھیک بات!

یوں تو جمعدارنی بھی ان تمام نوٹسوں کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا کرتی تھی! البتہ اگر آواز میں رکھائی کا عنصر واقعی غالب ہوتا تو وہ برش کرتے کرتے وہیں ڈال دیتی اور بکھرے ہوئے کوڑے کے درمیان پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتی اور وہ وہ سنسنی خیز خبریں سناتی کہ آخر اس کو بھی کھڑے سے بیٹھ جانا پڑتا اور نہایت چھچھاتی ہوئی آواز میں اس کو جھٹلاتی۔

''نہیں چلو! گو آن'' وہ یوں کہتی جیسے وہ اس کی بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں۔

''تم ہم سے مذاق کرتا!''

کہنے کو کہہ دیتی' لیکن اس کا دل دھڑ دھڑ کرتا کبھی ایسا نہ ہو کہ جمعدارنی سچ مچ ہی مان جائے کہ وہ اس کو بہکا رہی ہے' خدا کرے یہ بات سولہ آنے سچی نکلے کہیں دور اندر کی گہرائیوں میں کوئی دعا مانگتا کہ تنہا زندگی میں گرم خبریں اور افواہیں بڑی رونق پیدا کر دیتی ہیں'

پھر وہ جمعدارنی کے کچھ اور قریب آ جاتی۔

چنانچہ اس دن جمعدارنی کو اس حد تک دیر ہوئی کہ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ فرش خود ہی صاف کر لے گی اور برابر کے جمعدار سے بات کرے گی کہ ہمارا غسل خانہ دیکھ لیا کرو۔

الماری کے نیچے سے برش نکال کر وہ ہٹی ہی تھی کہ باہر جمعدارنی کی بالٹی کھڑکی جسے چھوڑ کر اب وہ اپنے مخصوص انداز میں پٹر پٹر کرتی داخل ہو رہی تھی۔

سلام میم صاحب جی!

وہ جمعدارنی کی آواز کے دھلے دھلائے انداز پر حیران رہ گئی' اتنی ڈھیٹ تو وہ کبھی نہ تھی' دیر ہو جاتی تو عموماً وہ کانکھتی کراہتی داخل ہوتی یا پھر منہ پھلائے گم سم آ کر کام میں لگ جاتی۔

غصے میں اضافہ ہو جانے کے باعث اس نے سلام کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور اپنی اسکرٹ سمیٹ کر گھٹنوں کے بل جھک کر فرش پر برش چلایا ہی تھا کہ اس نے برش پکڑ لیا۔

''چھوڑو ہٹاؤ میم صاحب' جاتی گسہ تھوک دو۔''

نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں اور حلق میں کوئی نمکین نمکین سا سیال اترتا چلا گیا' اور برش کو بدستور فرش پر چلاتے چلاتے بھرا بھرائی آواز میں جواب دیا۔

کوئی گل نہیں جمعدارنی ٹیک بات ہے تم برابر بیگم لوگ کوٹھی میں کام کرتا۔ اب ہم بڑا لوگ ہے' ریٹائرڈ لوگ ہے! اب ہمارا گورنمنٹ بھی نہیں..... اس کی آواز ٹوٹ گئی۔

ارے میم صاحب تم کیسا بات بولتا' ہمارے واسطے تم بہت بڑا آدمی ہے۔ پھر ایک دم ہی اس نے برش چھیننے کی کوشش کی۔

اور میم صاحب کے ہاتھ پہلے ہی ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ برش ہاتھ میں آتے ہیں جمعدارنی نے اپنی آواز کرکری کر لی۔ ہم تمہارا احسان نہیں بھولے گا۔ جب تم نے ماری کے باپ کو ہسپتال میں داخل کرایا تھا۔ اچھا تو جمعدارنی ایک کام تو کرو' میم صاحب نے ہسپتال والے ذکر اور جمعدارنی کی دبتی رگ سے فائدہ اٹھایا' آج تھوڑا ہمارا بوٹ پالش کر کے جائے گا۔

ارے میم صاحب میرے کو آج بڑی جلدی ہے' میں تو آج آئی ہی مشکل سے ہوں۔

تم جانو میرا دل تو یوں یوں کر رہا ہے' اس نے اپنی انگلیوں کی کلی کی سی شکل میں جوڑا اور پھر ہلایا' فرر فرر کر رہا' جب ہی تو میرے کو

دیری ہوگئی۔

کیوں کیا بات ہے؟ اس کے جھریائے ہوئے چہرے پر اسکنڈل کا نور برسنے لگا۔

''ارے میم صاحب' تم نے نہیں سنا' ہم تو جانتا تھا تم کو ساری بات کی خبر ہے۔''

''کیا کون سی بات۔'' اس نے اپنی کرسی کوڑے کے ڈھیر اور اس کے درمیان بیٹھی ہوئی جمعدارنی سے بھڑالی۔

''میم صاحب' رن کچھ کوئی جگہ ہے پاکستان میں؟ اتھے لڑائی ہوندی پئی ہے۔

آں! وہ کھبر! وہ تو ہم نیز پیپر کے وچ پڑھا ہے' مگر تم کو کی ہوندا ہے۔ میم صاحب نے بھی پنجابی جھاڑی۔

لو ہم کو کی ہوندا' تم کو ملوم ہے' ہمارا آدمی پرانا فوجی ہے' اور میم صاحب سارے پرانے فوجی واپس بلائے جا رہے ہیں' اب تم دیکھو میرا تو مانگی بھی بارڈر پر لگا ہوا ہے۔ چلو چھوڑوں' جمعدارنی' مانگی کا باپ اب بڑا آدمی ہے اس کو کون پوچھے گا۔

ارے میم صاحب' تم کو کھبر نہیں' تم بس ذرا سا اخبار پڑھ لیتی ہو کبھی ہو کبھی ریڈیو سن لیا اور ہم چاروں طرف ترتا فرتا ہے۔ بڑا وڈھا کوئی نہیں سب واپس چلو ملٹری وچ۔ آرڈر گھوم گیا ہے' اس نے ہاتھ ہلایا' مگر جمعداری مانگی کا باپ ہمارے ہاں کا ہے' ہم اب سٹھ اوپر پنج سال دا ہوا' آواز کی چہکار کے ساتھ چہرے کی رونق بھی بڑھ رہی تھی۔

''ہاں میم صاحب ہون دو' کون سنتا ہے۔''

اس کا مطلب ہے کہ..... پھر اس نے اپنا نچلا ہونٹ اپنے بچے کھچے دانتوں تلے دبا لیا۔

افواہ سنا دینے کے بعد جمعدارنی ہر طرح مطمئن ہو جاتی' چنانچہ ایسے دنوں میں اس کے جانے کے بعد بڑبڑ کرتے ہوئے اس کو از سر نو خود صفائی کرنا پڑتی تھی' مگر آج ایسا نہ ہوا۔

اور' یہ سن سنتھیا ماریشن کے لئے ایک عجیب اور اہم دن تھا اس کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس دن کا ہر ہر لحظہ اس کی نس نس میں سمایا جا رہا ہے اور ہر ہر لمحہ اس کے اندر زندگی کی دھمک بن بن کر اتر رہا ہے' اس کو یوں محسوس ہو رہا تھا' زندگی نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا ہے اور اسے آواز پر آواز دیئے جا رہی ہے' چنانچہ اکسائٹمنٹ سے پر یہ دن یوں گزرا کہ اسٹوو پر کچھ پکا کر کھانے کے بجائے بازار کے نان کباب پر اکتفا کرنے کے علاوہ شام کو ٹیوشنوں پر جانے کا پروگرام بھی ملتوی کرنا پڑا' تمام دوپہر وہ لیٹی خلاؤں میں گھورتی رہی تھی' دور شباب میں داخل ہوتی نوعمر لڑکی کی طرح جس کے پاس دل کی الٹی سیدھی دھڑکنوں سے نجات حاصل کرنے کا واحد علاج یہ ہوتا ہے کہ وہ چپ چاپ سیدھی لیٹ کر خلا میں تکنا شروع کر دے۔

رات گئے وہ بستر پر سے اٹھی' پلنگ کی پٹی کے قریب دونوں ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے بل جھکی اور تقریباً نصف صدی سے اوپر عرصے سے ہر رات دہرائی جانے والی دعا کے بول ایک نئی امنگ کے ساتھ ادا کئے۔

''خداوند' تیرا نام نامی منور ہو۔

تیری فرماں روائی غالب آئے۔

ہم کو ہر روز ہمارا رزق عطا کر۔

اور ہماری خطاؤں کو بخش دے۔

کیونکہ ہم بھی ان سے درگزرتے ہیں جنہوں نے ہم سے برائی کی۔

اور ہم کو آزمائش میں مبتلا نہ کر۔''

چنانچہ آج کی رات اس نے جمعدارنی کو بھی بخش دیا تھا کہ جس کی کی ہوئی برائیوں کی حد تھی اور نہ حساب۔

اور دوسری صبح اتنی مصروف اور ہول جول سے بھرپور تھی کہ چرچ جا کر نماز پڑھنے کا پروگرام ملتوی کرنا پڑا' اور یہ کوئی نئی اتوار نہ تھی۔ اس پر جب بھی ہول جول سوار ہوتی وہ گرجا گول کر جاتی' آج اسے کتنے بہت سے کام کرنے تھے۔

الماری کے اوپر چڑھا کر رکھے ہوئے چمڑے کے گھسے ہوئے' لیکن مضبوط سوٹ کیس کو اتار کر اس میں یادگار چیزوں کپڑوں اور تصویروں کی سب سے نچلی تہ میں دبی ہوئی دلکاء والی خاکی وردی نکالنا۔ اس کے تمام بٹن اور بکسوئے براسو سے چمکانا..... پھر وردی کو لانڈری میں ارجنٹ دھلائی کے لئے لیجانا۔ بابا کیا ٹھیک ہے کس وقت کال آ جائے۔ وہ کمرے کی تنہائیوں کو بار بار سمجھاتی رہی تھی کہ اس کو ہر بار شبہہ ہوتا تھا کہ وہ اس کی عجلت اور سراسیمگی پر ہنس رہی ہیں اور پھر یہ ویکائیوں والے بوٹ تو اکڑ کر بالکل لکڑی ہو رہے ہیں نہیں معلوم اب وہ پیروں میں ڈھیلے رہیں گے یا پھر بالکل ہی تنگ ہو چکے ہوں گے۔ یہ آرمی والا لوگ کی یہی تو مصیبت ہے کہ بس ایک دم ٹپ ٹاپ کام مانگتا۔ وہ پھر اپنی تنہائی سے مخاطب ہوئی۔

جمعدارنی کو داخل ہوتے دیکھ کر وہ دل ہی دل میں جز بز ہو گئی تھی' یہ اتنے سویرے سے آ گئی اور اس کا تو سارا کام پڑا تھا۔ مختلف چیزوں کے پیکٹ بنا کر ان پر دوستوں اور جاننے والوں کے نام لکھنا کہ بالفرض وہ واپس نہ آ سکی تو جس سے جس چیز کے دینے کا وعدہ کیا ہوا ہے وہ اس تک پہنچ تو جائے۔

ہاں تو یونیفارم اب ڈھلی تو ہو گئی ہو گی' خیر نئی سلنے تک تو کام آ ہی جائے گی..... اور پھر وہ ممی کے بالوں کی لٹ والا لوکٹ بھی

تو گلے میں ڈالنا یاد رکھا ہے' اس کے علاوہ البم کی تصویروں کو ایک نظر پھر دیکھنا..... اور ایڈنا کا پتا تلاش کرنا کہ ایسی تمام خاندانی یادگاریں اس تک پہنچائی جا سکیں اور اس کو بھی تو آخری بار خط لکھے کوئی بیس سال ہو گئے۔

''میم صاحب آج چرچ نہیں گیا۔'' جمعدارنی نے اس کو سر جھاڑ منہ پہاڑ رسوں پر چانی چزوں میں الجھے دیکھ کر سوال کیا۔

اب ہم چرچ فرصت سے جائے گا' بابا ہمارے کول اتا ٹیم کدر سے آ گیا۔

اور اس کو تعجب سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر وہ سخت ناراض ہوئی۔

بابا تم بات سمجھتا نہیں اپنی بولتا ہے' ہم آرمی والا لوگ جا چھٹی کبھی پکا نہیں ہوتا۔ ادھر تمہارا سول کا افسر ہے' ایک واری رٹائر ہوا فیر کبھی سرکار مڑ کر بھی اس کو نہیں دیکھتا۔ مگر ہمارا ملٹری کے لوگ کا یہی تو مشکل ہے۔ جب سرکار پر مشکل ٹیم آتا' فوراً کال کر لیتا۔

دوسری صبح ماری یعنی جمعدارنی نے اس کو پہلے سے بھی زیادہ اینٹھا ہوا اور اکڑفوں کے عالم میں پایا تھا اور وہ پورے وقت اس سے آرمی کے اصطلاحوں میں پورے رعب سے بات کرتی رہی تھی۔

مگر میم صاحب تم کو تو نہیں کال آئے گی۔

کیوں' ہم کو کال کیوں نہیں آئے گی؟ وہ چیخ کر بولی۔ ہم آرمی والا نہیں کیا۔ یہ یونیفارم کیا ہمارے پاس یوں ہی آ گیا' اس نے کلف استری سے تیار ہینگر میں لٹکی یونیفارم کی طرف اپنا سفید سر اٹھا کر دیکھا جو اس نے اتوار پر ڈبل کو بھی ڈبل رقم دے کر ارجنٹ دھلوائی تھی۔

مگر میم صاحب تم تو انگریز کی ملٹری میں تھا' تم کتنی بار بولا ہم پاکستان کا نہیں ہے' ہم ولایت کا ہے۔

ہاں' ہم پاکستان کا نہیں مگر آرمی کا تو ہے۔ آرمی جس وقت کال کرتا ہم انکار کرے تو گرفتار ہو جائے۔

مگر میم صاحب! تم وہاں پر کیا کر سکتی ہو' اب تم بڈھا ہو گیا۔

اب جمعدارنی ذلیل حربوں پر اتر آئی تھی۔

اور تمہارا مالک مانگی کا باپ ابھی بہت تکڑا جوان ہے جس کا کال آنے کے ڈر سے تمہارا اس ماف دل فرو فرو کرتا۔ اس نے انگلیاں چلا کر بتائیں' پھر اس نے فوراً آواز بلند کر بڑی رکھائی سے کہا۔

ماری کی ماں اب زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کی بات ہے۔ تم بولے تو ہم ساتھ والوں کے جمعدار سے بات کرے فیر تو ہم فرنٹ کی ہوا کھائے گا۔

آواز کے روکھے پن نے ماری کی ماں کے لب سی دیئے ورنہ وہ ایک سوال اور کرتی کہ وہاں جا کر کرو گی کیا۔

اور یہ سوال اس سے ان بچوں نے کر لیا جن کو وہ ٹیوشن پڑھانے جاتی تھی۔

تم اپنی ممی کو بولو کہ تمہارے واسطے دوسرے ٹیوٹر کا انتظام کر لیں' اس نے سب سے بڑے لڑکے کو ممی کے پاس جاتے ہیں بھیجا' جو اس خبر کو سن کر یوں بول اٹھیں تھیں کہ اتنے درست اور عمدہ لب و لہجے میں انگریزی بولنے والا دوسرا ٹیوٹر تو سر مونڈ لے گا۔

چنانچہ وہ اپنی ادھوری ناول کو بستر پر اندھا کر چپل گھسیٹتی اپنے بیڈروم سے نکل آئیں تھیں اور آتے ہی انہوں نے سوال کیا۔

کیوں مسز ماریسن کی بچے تمہیں ستاتے ہیں؟ اچھی بات ہے آنے دو ان کے ابو کو۔

اور بچوں کی ماں کو جو مسز ماریسن کو یوں اچھی لگتی تھی کہ اس کی انگلش امریکن اثرات سے پاک ہوا کرتی تھی۔ یوں بولائے ہوئے دیکھ کر ان کا دل کڑھ گیا تھا' مگر کیا کیا جاء' آرمی کی مجبوری تو سب ہی جانتے ہیں۔

بہر حال ان کی معذرت پر وہ تو ان سے الجھنے کے بجائے مطمئن سی نظر آنے لگی تھی' زیر لب البتہ مسکرائی تھی اور پھر اندر آ کر دوبارہ ناول گم ہونے سے پہلے اس نے اپنے بیٹے کو سمجھایا تھا۔

''چلو جاؤ تم اطمینان سے پڑھو' پگلی ہیں وہ تو۔''

بہر حال وہ اپنے نسلی کردار کے مطابق قبل از وقت نوٹس دے کر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی کہ اس نے انہیں اندھیرے میں نہیں رکھا تھا' البتہ بچوں نے سوال کر کر کے اس کو زچ کر دیا۔

''تم آخر وہاں کیا کرو گی؟''

کیوں میں ایکس ولکائی جو ہوں' میں نے ہسپتال میں کام بھی کیا ہے' پیراشوٹ بھی پیک کئے ہیں' اب ہسپتال کے تو کام کی میں نہیں' پیراشوٹ پیک کروں گی۔

پتا ہے اب ٹینکوں سے لڑائی ہوتی ہے۔

سب پتا ہے میں فرنٹ پر رہی ہوں۔ تم کیا سمجھتے ہو' اس نے نہایت حقارت سے بچے کو گھورا۔

منجھلا لڑکا ذرا زیادہ جز رس تھا اس نے اپنی کھلی کھلی آنکھیں گھما کر کہا' مگر پتا ہے تم انگریز ہو جو کسی نے تم کو اپسائی سمجھ لیا' تو جاسوسی میں پکڑی جاؤ گی۔

''کیوں کیوں! جاسی کیوں'' وہ اتنی گرم ہوئی کہ ماں کو ایک بار پھر ناول کی دنیا اور بیڈروم سے نکال کر بیچ بچاؤ کے لئے آنا پڑا۔

مگر وہ رپ رپ کرتی اٹھی اور یہ جا وہ جا۔

چنانچہ دوسری شام ٹیوشن پر وہ آئی نہیں' بلکہ لائی گئی کہ یہ ماں خود گاڑی لے کر گئی اور زبردستی گھیر گھار کر گاڑی میں سمجھو بند کر لائی' کہ اس کا نظریہ یہ تھا کہ بچے جو بھی زبان سیکھیں اور بولیں وہ درست تلفظ اور انداز میں۔

لڑنے کو تو وہ لڑتی تھی مگر جمعدارنی تک نے یہ بات محسوس کی کہ میم صاحب کی چڑھی کمان ڈھیلی سی پڑ گئی ہے' اور قصہ یہ تھا کہ جو جو کال آنے میں دیر ہو رہی تھی وہ ہو جمعدارنی کو جلد جلد نوٹس مل رہے تھے۔ اب پھر اس کو ممی کے زمانے میں آئینے مافق ہونے والی صفائی کے تذکرے سننے پڑتے۔ کمرے کے آخری سرے والے کونے پر رکھی ہوئی پتھر کی چھوٹی سی میز پر رکھے اسٹوو میں ہوا بھرتے بھرتے وہ جمعدارنی سے کہتی بات یہ ہے کہ یہ ہمارا لینڈ نہیں ہے اور بابا ہم اور کچھ کرنے نہیں مانگتا' بس ٹھیک ہے ٹائم لگتا ہے' لگنے دو۔

تو پھر وہ بھی ٹکڑا لگاتی' مگر میم صاحب جی تمہارا بھائی بھی ادھر کو گیا بہن بھی گیا' پر تم ادھر ہی پڑا ہے' صاحب تمہارا نہیں' بچہ تمہارا.....

دیکھو جمعدارنی بات یہ ہے کہ ہمراہ باپ ادھر سے آیا ہمرا ماں مکسڈ بلڈ ہو گیا وہ اینگلو انڈین کا لفظ استعمال کرنے سے احتراز کرتی تھی' پھر ہم ادر پیدا ہو گیا' ادر سرد بہت ہوتا۔

مگر میم صاحب وہ لوگ بھی تو ادھر ہی پیدا ہوا تھا۔

بائی تم کیا بات بولتا وہ ایک دم جھلا کر رعب جماتی' اور اس ماڈل کا لوگ نہیں مانگتا اس نے کندھے جھلا کر گردن ایک طرف کر کے نقل کی' اور ایک دم چست چالاک آدمی مانگتا۔

پھر یوں ہوا کہ وہ جمعدارنی فرش پر برش کرتی رہی اور وہ چہچہاتی ہوئی آواز میں قصے پر قصہ سنایا کرتی' سرخ اینٹوں والی اس کوٹھی کے بننے کا قصہ' جس کو وہ اس شرط پر بیچ چکی تھی کہ اس کے پچھلے حصے کا ایک کمرہ اور غسل خانہ وہ اس وقت تک استعمال کرتی رہے گی جب تک کہ وہ زندہ ہے یا وطن نہیں چلی جاتی۔

میم صاحب یہ ساری گئی گزری باتیں اس سے بہت بار کر چکی تھیں۔ جب بھی وہ مسلسل تنہائی کے روگ سے اکتا جاتیں' جب بھی انہیں یہ محسوس ہونے لگتا کہ زندگی ان کو چوسی ہوئی گنڈیری کے پھوک کی طرف ڈال کر بھول گئی ہے' تو پھر وہ زور شور سے سارے قصے دہرانا شروع کر دیتی تھیں۔

اے بابا ہم ادھر ہی اسی بنگلے میں پیدا ہوا تھا۔ یہ جواب ان کے صاحب لوگ کا اسٹڈی بن گیا ہے وہ ہمارا نرسری ہوا کرتا تھا۔

فیر جب بیرا ہم کو اسکول سے واپس لاتا تھا' ہمارا ممی ادھر گیٹ پر کھڑا انتظار کرتا ہوتا تھا' فیر ہم کو ایڈنا کو اور چھوٹا نکسن صاحب ہوٹ ہوٹ ملک' ہوم میڈ جیم اور لبڑ کھانے کو ملتا۔ فیر لوٹے ویلے ہم گھوڑے کی سواری کرتا۔ اے دیکھو! ادھر جیہڑا باغ کا حصہ کھالی پیا ہے' ادھر ہمارا اسی سالگا ہوا تھا۔

وہ جمعدارنی کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کی خاطر حد بھر اسی کی زبان میں اپنی داستان ماضی کو دہراتی تھی کہ یہی تو ایک ہستی تھی کہ مگن ہو کر اس کی باتیں زیادہ سنتی اور کام کم سے کم کرتی۔ حد یہ ہے کہ بھول جاتی کہ ابھی اس کو اور جگہ بھی جانا ہے' چنانچہ جب گرینڈ فادر کلاک ٹن ٹن کر کے ایک بجاتا' تو وہ پرشوق آواز میں اس کو لنچ میں شریک ہونے کی دعوت دے دیتی۔

''بس اب چند گھنٹوں ک بات اور ہے۔'' اس نے تاسف سے اپنے ہفتہ بھر کے راشن کو دیکھا' انڈے' جام اور کیک رس کے علاوہ انرجی فوڈ بسکٹ کا ڈبا اور پھر دیوار کے ساتھ بنی ہوئی الماری کے نچلے خانے میں رکھے گھی' شکر اور شاول کے ڈبوں کے متعلق سوچا جو اس نے کاؤ اینڈ گیٹ ملک کے ان میں محفوظ کر رکھے تھے جن کی تاریخ یہ تھی کہ اس نے اکثر جمعدارنی کو بڑے فخر سے بتایا تھا کہ معلوم ہے یہ ملک کے ڈبے کہاں سے آئے ہیں بتاؤ؟ تچھا تم گیس کرو' پھر خود ہی بے صبری سے بتانا شروع کر دیتی' یہ برٹی کے دودھ کے ڈبے ہیں' چھوٹا نکسن صاحب' برٹی تو بے بی آف فیملی تھا' سب کا فیورٹ' وہ اس کی نہ ختم ہونے والی شرارتوں کی کہانی چھیڑ دیا کرتی تھی۔

اور اب تو یہ ساری کہانیاں' یہ ڈبے باغ کی کہنہ دیوار اور اس پر پھیلی ہوئی زرد گلابوں والی وہ بیل' جو پپا نے اپنے ہاتھ سے لگائی تھی سب ہی چند گھنٹوں کی مہمان ہیں۔

ٹیک کی بنی اور مہوگی کے رنگ والی والی بیضوی میز کے سرے پر بیٹھ کر اس نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنا پسندیدہ کھاجا یعنی پلیٹ میں پڑا ہوا اجلے اجلے چاولوں کا خشکہ' ہلدی چڑھی مسور کی دال اور ٹماٹر ساس ختم کرے گا' مگر ایسا نہ ہو سکا۔ نہیں معلوم کیوں آنسو ابل ابل کر باہر نکل پڑنے کی دھمکیاں دے چلے جا رہے اور نوالے حلق میں اس طرح پھنس رہے تھے جیسے کبھی بچپن میں خلاف مرضی پر روٹھ کر وہ کھانا کھانے سے قاصر رہتی تھی۔

کمرے کے عین وسط میں بکھری سی کوڑے کی وہ ڈھیری اور اس کے قریب پڑا برش اس کو ان دھماکوں' اس خبر اور اس اعلان کی یاد دلا رہا تھا جس کو سنتے ہی جمعدارنی ہاتھ سے برش ڈال کر سیدھی گھر کی طرف لپکی تھی' لاہور پر ہندوستان کے چڑھ دوڑنے کی خبر سن کر

اس نے نفرت سے حقارت اور حقارت سے ناک سکوڑ لی تھی' لیکن جب اس نے صدر کو دفاعی جنگ کا اعلان کرتے سنا تو یک بہ یک اسٹور ہو بند کر دیا اور پھر چونک کر دوبارہ جلایا تھا کہ ابھی تو دال میں پھرک بھی نہ آئی تھی۔

اس ن اس کوڑے کی طرف خیال بھی نہ کیا تھا کہ جسے مانگی کی ماں کمرے کے عین وسط میں چھوڑ کر چل دی تھی۔ پھر ایکا ایکی اس نے کانٹا ایک طرف رکھ دیا' پلیٹ سرکا دی اور پھر نہ جانے وہ کس سے مخاطب ہوئی۔

مگر کیوں' یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا' یو سلی فولز! بلڈی باسٹرڈز! تم میرے گندے کمرے کا مذاق ہرگز نہیں اڑاؤ گے۔ تم کیا سمجھتے ہو۔ میں ہراساں نہیں ہو' اس نے مضبوطی سے الماری کے اوپر رکھے اس کہنہ و بوسیدہ سوٹ کیس کی طرف دیکھا جس میں اس نے ویکائی کی یونیفارم کو ایک بار پھر احتیاط سے سنبھال کر رکھ دیا تھا۔

چنانچہ وہ برش سے کوڑا سمیٹتے وقت مانگی اور ماری کی ماں کو برا بھلا کہنے کے بجائے سلی فولز پر بگڑتی اور بڑبڑاتی رہی تھی۔

اس نے اس شہر کی گلیوں اور شاہروں کی سلامتی کی دعا بھی عجب انداز سے مانگی۔

بات یہ ہے کہ کسی شہر کے چپے چپے کی حفاظت کا ٹھیکا فقط ایک انسان اور وہ بھی بوڑھا' خستہ اور درماندہ وجود تو نہیں لے سکتا' چنانچہ اس کا بوڑھا اور تنہا دل چپکے چپکے میوگارڈنز کے پیچ و خم اور اس کے آگے مغل پورہ جانے والے بانسوں کے دورویہ جھنڈوں اور گھنے درختوں کے سائے تلے چھپی ہوئی سڑک اور برٹ انسٹی ٹیوٹ کی حفاظت اور سلامتی کی دعا کرتا رہا تھا' کہ بہرحال اس سب کا بھی تعلق ماضی کی ایک تاریخ اور ایک حقیقت سے تھا اور پھر یہ کہ آدمی کا تصور اس کی چھوڑی ہوی راہ گزاروں پر اگر ٹہلتا ہوا بھی جا نکلے تو بسرائی ہوئی یادوں کے اتنے دفینے اور اتنے انبار ہر سو اور ہر موڑ پر نظر آئیں کہ ان کا سمیٹنا بھی مشکل ہو جائے۔

اس شام اس نے اپنی کھڑکی کے ادھ کھلے دروازے میں سے پھوٹی ہوئی شفق کو بھی نہ دیکھا تھا اور یہ اتفاق کتنے برسوں بعد ہوا تھا اسے یاد بھی نہ آ رہا تھا۔ ہر روز کی طرح سامنے والے اونچے درختوں کی چوٹیاں اندھیرے میں ڈوبتی جا رہی تھیں' اس نے کھڑکی بند کر دی تھی کہ اسے معلوم تھا کہ آج کی شام روشنی کے سامنے والے کھمبے پر کوئی بتی نہ جلے گی اور وہ اس اونچے سفید مکان کی بلائی منزل کی کھڑکیوں کے شیشوں میں سے آتی ہوئی دلچسپ روشنیوں کا نظارہ نہ کر سکے گی۔ کھڑکی اس نے بند کر دی اور پردہ برابر کر دیا تھا' میں چاہوں تو اپنی میز کے نیچے موم بتی روشن کر سکتی ہوں' لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

پھر اس نے آخری بار پردے کی جھری میں سے اندھیرے میں تحلیل ہوتے ہوتے شہر کے نظاروں کو خدا حافظ کہا اور تقریباً ٹوٹی ہوئی اپنے پلنگ کے قریب جا کر دوزانوں ہو گئی۔

پھر کمرے کے اندھیرے ماحول نے دھیرے دھیرے بلند ہوتی ایک آواز سنی۔

خداوند تیرا نام نامی منور ہے۔

اور تیری فرماں روائی غالب آئے

ہم کو ہر روز ہمارا رزق عطا کر

پھر اندھیرے نے اس آواز میں لرزش کو محسوس کیا۔

اور ہماری خطاؤں کو بخش دے۔

کیونکہ ہم ان سے درگزر نہیں کریں گے کہ جنہوں نے ہمارے ساتھ برائی کی۔ آواز لرزی اور ٹوٹ گئی۔

خاموش اور مبہوت اندھیرے نے دوبارہ مضبوط اور غضبناک آواز سنی۔ کیونکہ ہم ان سے درگزر نہیں کریں گے کہ جنہوں نے ہمارے ساتھ برائی کی۔ اس لئے تو ہم کو آزمائش میں مبتلا نہ کر۔

پھر وہ شرمسار اور بوجھل ضمیر کے احساس کے ساتھ پلنگ پر بیٹھی رہی کہ دعا کے الفاظ میں تحریف کی مرتکب ہوئی تھی کہ اس نے الفاظ بدلے کہ اس نے عاجزی اور انکسری کے بجائے جارحانہ لب ولہجہ اختیار کیا کہ اس نے یہ کہنے کے بجائے کہ:

ہم ان لوگوں سے درگزر کرتے ہیں کہ جنہوں نے ہماری ساتھ برائی کی' درگزر سے انکار کیا۔

اور اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ ہم کو آزمائش میں مبتلا نہ کر۔

وہ 23 دسمبر کی سہ پہر تھی جب اس نے پہلی مرتبہ اپنے گردوپیش پر فرصت کی نظر ڈال۔ چائے کے پیکٹوں' گھٹیا اور بڑھیا سگریٹ کے بنڈلوں سے بھری لکڑی کی پیٹیوں اور دیسی صابنوں کے انبار میں سے اٹھتی ہوئی عجیب جھاردار بوتیل اور گھی کے بند ڈبوں کے درمیان لکڑی ک خالی پیٹی پر بیٹھے اس کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ ایک لمبے سفر پر سے واپس آئی ہے اور انگلیوں پر گن لئے جانے والے ان سترہ دنوں کا یہ وقفہ کتنا تھکا دینے والا تھا۔

پھر اس نے فرش سے چھت تک جاتے ہوئے اس سامان کو غور سے دیکھا یہ سب کہاں سے کس وقت اور کس طرح آ گیا تھا اور نہ جانے کتنا سامان ہم بھیج چکے ہیں۔ اس نے سوچا تھا اور آج اس بات کو سوچتے ہوئے بھی ایک ہفتے سے اوپر ہو چکا تھا' اور وہ سامان والے نچلے سیکشن سے ہٹ کر اوپر سوچتے ہوئے بھی ایک ہفتے سے اوپر ہو چکا تھا' اور وہ سامان والے نچلے سیکشن سے ہٹ کر اوپر اس شعبے میں کام کر رہی تھی جہاں پر شہر بھر کے اکٹھا کئے ہوئے کپڑے آزاد کشمیر اور دوسرے کیمپوں میں بھیجے جانے کے لئے بوروں

میں ٹھونس ٹھونس کر بند کئے جا رہے تھے۔

صبح سے لے کر دوپہر تک وہ بڑا سا سوا اور ستلی لئے بوروں کے منہ سیتی رہتی اور تب ہی اس کا دل اس کام سے بھی اچاٹ ہوا۔ یعنی جس بنا پر وہ نچلے سیکشن سے اوپر آئی تھی وہی بات یہاں بھی اس کو بور کر رہی تھی۔ بوروں میں کپڑا ڈالنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے گھپلے اب اس کی برداشت سے باہر ہو چکے تھے۔ یعنی اگر فقط بات اسی حد تک ہوتی کہ ان میں سے کئی لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کی نظر بچا کر خوب صورت بہتر اور معزز کپڑے میز کے اس طرف سے سلے ہوئے بوروں کے پیچھے نکال نکال کر ہی ڈالتے رہتے تو اس کو اس درجہ اعتراض نہ ہوتا۔ ٹھیک ہے اعلیٰ اور معزز کپڑے چین سے گھروں میں بیٹھنے والوں شہر کی سڑکوں پر گھومنے والے لوگوں ہی کو زیب دیتے ہیں نہ کہ کیمپ میں پڑے ہوئے مصیبت زدوں کو۔ اور شاید وہ یہ بھی گوارا کر لیتی کہ یہاں کام کرنے والوں کو گھڑی گھڑی چائے کی کشتیاں منگانے کی حاجت محسوس ہوتی ہے اور پھر یہ کہ نیچے سے بسکٹوں کے ڈبے لا کر کھولے جاتے ہیں۔ مگر وہ چراغ پا تو اس بات پر ہوئی کہ یہاں پر لڑکے اور لڑکیاں جن امور کو طے کر رہے ہیں' ان معاملات کو طے کرنے کے لئے یہاں سے مناسب کئی اور جگہیں موجود ہیں' مثلاً کالجوں کے لان' لارنس باغ کے گوشے اور ایسی ہی بے شمار مناسب جگہیں۔ آخر یہ کیا ضروری ہے کہ پریشان کن اور تکلیف دہ موقعے سے ہی فائدہ اٹھایا جائے' شاید یہ سب کہتے ہوئے وہ کافی جوش میں تھی اور شادی اس نے بلند اور لرزتی آواز میں اپنے حوالے سے یہ بھی ذکر کیا تھا کہ ہم نے جب ایک ایسی جنگ لڑی تھی جو ہم سے ہزاروں میل دور ہو رہی تھی تو دن کو ہم ایسی جگہوں پر انتہائی سنجیدگی اور موقعے کے احترام کے ساتھ کام کرتے اور پھر شام کو برٹ میں جا کر ایسے امور طے کیا کرتے تھے' اور وہ بیگم جو نہایت خوش لباس تھی اور ستھرا مذاق سنگھار کھلتی تھی شاید بہت نرم خو اور بردبار تھی جس نے بڑی نرم اور سلجھی ہوئی آواز میں اس کو سمجھایا تھا۔

چونکہ ایمرجنسی ختم ہو چکی ہے اور ان بچارے لڑکے اور لڑکیوں نے اتنے دن تک جذباتی اعتبار سے نہایت سخت وقت گزارا ہے' اس لئے ان کے ہنس بول لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ پھر اس نے اس پر یہ بھی واضح کیا تھا کہ چونکہ اس کا اپنا وقت گزر چکا ہے' اس لئے بہتر ہے کہ ان معاملات کو ان ہی پر چھوڑ دے جن کا یہ وقت ہے' چنانچہ اس کے بعد اس کے بڑھاپے کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت خلیق اور نرم آواز میں اس کی اتنے دن کی مستعدی اور محنت کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا تھا کہ ایمرجنسی کے ختم ہو جانے کے بعد اب ایسا کوئی کام باقی نہیں رہا ہے' چنانچہ یہ تمام شعبے رفتہ رفتہ ختم کر دیئے جائیں گے لہٰذا اب اس کو مزید تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔

وہ چکرا کر اس بورے کے قریب والے اسٹول پر بیٹھ گئی جس کا منہ وہ سی رہی تھی۔ پھر اس نے سرے کی سلائی کو پکا کیا اور قینچی سے ستلی کو کاٹ دیا۔ ستلی کا گولا' زنگ آلود سوا اور قینچی اس نے بیگم کے سامنے میز پر رکھی اور کسی کو خدا حافظ کہے بغیر بیک بے کراں سناٹا

لئے ہوئے وہ باہر آ گئی۔ آج ایک بار پھر اس کے دل نے اس حقیقت کو مان لیا تھا کہ اس کا وقت گزر گیا ہے۔

چنانچہ اتنے تنہا کمرے میں بیٹھ کر ایک بار پھر اس نے مانگی کی ماں اور اس کی لائی ہوئی افواہوں اور اسکینڈلوں کا شدت سے انتظار کیا تھا کہ ایسے میں یہ افواہیں اور اسکینڈل اور مانگی کی ماں جیسے انسان ہی سب سے بڑا سہارا ہوا کرتے ہیں۔

◆◆◆